www.mohaddis.com

329

مدیر اعلیٰ
حافظ عبد الرحمن مدنی

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

محدث

مئی ۲۰۰۹ء

۲ سوات میں نفاذِ شریعہ اور طالبانائزیشن
۱۰ جدید اعتزال کے فکری ابہامات
۲۰ متن 'نظامِ عدل ریگولیشن' و معاہدۂ امن

مجلس التحقیق الاسلامی
ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیرِ اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی **مُدیر:** ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہورہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فی شمارہ: ۲۰روپے **زرِ سالانہ:** ۲۰۰روپے **بیرون ملک:** ۲۰ڈالر

بذریعہ منی آرڈر/بینک ڈرافٹ ۲۰۰روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی وتحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔ **ایڈریس:** ماہنامہ محدث، ۹۹جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰

فون نمبر: 35866476 / 042 - 3586639 **موبائل:** 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.kitabosunnat.com __ www.mohaddis.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

اجرائے مُحدث کے مقاصد

- عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!
لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

- علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!
لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

- غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!
لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

- تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!
لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

- آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!
لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

- جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!
لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

مِلّتِ اسلامیہ کا علمی و اِصلاحی مجلّہ

ماہنامہ مُحدّث لاہور پاکستان

مُدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمن مدنی

مُدیر: حافظ حسن مدنی

Only For SMS
0333-4213525

جلد ۴۱ / شمارہ ۵ — جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ — مئی ۲۰۰۹ء

فہرست مضامین

فکر و نظر

سوات میں نفاذِ شریعہ اور طالبانائزیشن — ڈاکٹر محمد امین — 2

حدیث و سنت

جاوید احمد غامدی اور انکارِ حدیث — محمد رفیق چودھری — ۲۱

معاہدہ امن

تحریک نفاذ شریعت اور علما کی ذمہ داریاں — حافظ محمد زبیر — ۲۸

'نظام عدل ریگولیشن ۲۰۰۹ء' کا اُردو متن — ۴۰

حکومت اور تحریک کے مابین 'معاہدۂ امن' کا متن — ۴۶

اعلامیہ اجلاس 'ملی مجلس شرعی'، منعقدہ جامعہ نعیمیہ، لاہور — ۴۷

فقہ و اجتہاد

ویڈیو، سی ڈی سے سکرین پر تصویر کا حکم — ڈاکٹر عبدالواحد — ۴۹

تحقیق و تنقید

جدید اعتزال کے فکری ابہامات کا جائزہ — زاہد صدیق مغل — ۶۰

ادبِ عربی

قابل رشک لمحۂ مسرت — عبدالجبار سلفی — ۷۷

زرِ سالانہ: ۲۰۰/= روپے
فی شمارہ: ۲۰/= روپے

بیرونِ ملک
زرِ سالانہ: ۲۰/= ڈالر
فی شمارہ: ۲/= ڈالر

Monthly MUHADDIS A/c No: 984
UBL - Model Town Crossing, Lahore

دفتر کا پتہ
۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن لاہور 54700

☎ : 5866476
5866396
5839404

Email:
hhasan@wol.net.pk

Publisher:
Hafiz Abdul Rahman Madani

Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore

Islamic Research Council

مُحدّث کتاب و سُنّت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکر ونظر

سوات میں نفاذِ شریعت اور طالبانائزیشن

معتدل اسلامی موقف

سوات میں 'نظامِ عدل ریگولیشن' کے بعد پاکستان بھر میں نفاذِ شریعت کی بحث ایک بار پھر تازہ ہوگئی ہے۔ 'نظامِ عدل' ریگولیشن کی حقیقی نوعیت سے ملکی اور بین الاقوامی میڈیا نے تو عوام کو تا حال متعارف نہیں کرایا بلکہ میڈیا تحریکِ نفاذِ شریعت کے سربراہ صوفی محمد کے اُفکار کو اپنے طور پر اُچھالنے میں مشغول ہے۔ اس تناظر میں یہ پہلو بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ مغرب کے جدید سیاسی اور معاشی افکار (جمہوریت اور اشتراکیت) کی جن مسلم اہل علم نے اسلامی جمہوریت' اور 'اسلامی اشتراکیت' کے نام سے حمایت کی تھی، ان کا مقصد اشتراکیت وجمہوریت کی بجائے درحقیقت کسی بھی شکل میں اسلام کے غلبہ ونفاذ کی منزل تک پہنچنا تھا۔ اس پہلو پر ڈاکٹر محمد امین نے زیرِ نظر مقالہ میں بھی روشنی ڈالی ہے جسے ہم بلاتبصرہ فکر ونظر کے کالموں میں اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ محدث کی اِدارتی رائے اِنہی کالموں میں آئندہ پیش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

مولانا صوفی محمد اور طالبان نے سوات میں نظامِ عدل اور نفاذِ شریعت کے حوالے سے جو امن معاہدہ حکومتِ پاکستان سے کیا ہے اور اس کے بعد مولانا صوفی محمد صاحب نے جو تقاریر کی ہیں، ان میں سے دو باتیں اہم تر ہیں: ایک یہ کہ جمہوریت کفر ہے اور دوسرے یہ کہ پاکستان کا موجودہ عدالتی نظام غیر شرعی اور ناقابل قبول ہے۔ اس حوالے سے جن لوگوں کو مولانا صوفی محمد صاحب کے خیالات سے اختلاف ہے، اُنہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ طالبان کی شریعت ہے جو ہم نہیں مانتے۔ جب کہ بعض لوگ مولانا صوفی محمد کی حمایت کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ اس مرحلے پر کنفیوژ بھی ہو گئے ہیں اور اُنہیں سمجھ نہیں آ رہی کہ اس بارے میں صحیح اسلامی موقف کیا ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں ایک عام پاکستانی مسلمان کو اپنا ذہن واضح رکھنے کے لئے چار سوالوں کا دوٹوک جواب ملنا چاہئے:

① کیا جمہوریت کفر ہے؟

② کیا پاکستان کا عدالتی نظام غیر اسلامی ہے؟

③ کیا طالبان کا اسلام صحیح ہے؟

④ موجودہ حالات میں نفاذِ اسلام اور طالبانائزیشن کے حوالے سے صحیح اسلامی موقف کیا ہونا چاہئے؟

یہ سوالات وقتی اور سیاسی ہونے کے علاوہ علمی پہلو بھی رکھتے ہیں جو تفصیل طلب ہے۔ اب ہم ہر ایک سوال کا مستقل طور پر جواب دینے کی کوشش کریں گے:

❶ کیا جمہوریت کفر ہے؟

اس سوال پر غور کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس وقت دنیا پر مغربی تہذیب کا غلبہ ہے۔ مغرب نے اپنے معاشی، سیاسی اور حربی تفوق کو اپنے فکری غلبے کا ذریعہ بنایا ہے اور یوں وہ اپنی تہذیب کی یونیورسلائزیشن کی مہم پر کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مسلم دنیا کو بھی پہلے اس نے بزورِ بازو فتح کیا، کچلا، تباہ و برباد کیا اور پھر ان کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لئے مسلم ممالک میں اجتماعی ادارے (سیاسی، معاشی، قانونی، سماجی، تعلیمی.....) اپنی فکر و فلسفے پر قائم کئے اور مسلمانوں کے دل و دماغ کو فتح کرنے کی بھرپور کوشش کی جس میں اسے خاصی کامیابی ملی۔ مغرب نے اپنے ہمہ جہتی تہذیبی غلبے سے جن افکار و تصورات کو بالعموم دنیا میں اور بالخصوص مسلم ممالک میں مروّج کیا ہے، ان میں سے ایک جمہوریت بھی ہے۔

مغرب نے جمہوریت کو بطورِ ایک عقیدہ، ایک دین اور مسلمہ اُصول دنیا میں رائج کیا ہے گو وہ اپنے مسلمات کے لئے 'دین' اور 'عقیدہ' کے الفاظ استعمال نہیں کرتا، کیونکہ مغربی تہذیب تحریکِ اصلاح مذہب (Reformation) اور تحریکِ تنویر (Enlightenment) کے دوران مذہب (عیسائیت) کو ردّ کرنے کے نتیجے میں آگے بڑھی تھی، لیکن ان افکار کی عملاً دنیائے مغرب میں وہی حیثیت ہے جو دین و مذہب کے ماننے والوں کے ہاں عقیدے کی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جمہوریت مغربی تہذیب کا عقیدہ اور مسلمہ اُصول ہے جس کے حسن و قبح پر بات کرنے اور اسے ردّ کرنے کے امکان کی کوئی گنجائش نہیں۔

بدقسمتی سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی مغربی تہذیب کے زیر اثر جمہوریت کو بطورِ عقیدہ اور بحیثیتِ طے شدہ مسلمہ اُصول مان لیا ہے اور وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ مسلم سیاستدانوں، صحافیوں، ادیبوں، دانشوروں بلکہ علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد بھی، خصوصاً وہ جو عملی سیاست میں ہیں، جمہوریت کو بطورِ عقیدہ اور طے شدہ مسلمہ اصول

مانتی ہے اور اس کے خلاف کوئی دلیل سننے کو تیار نہیں۔

لیکن بایں ہمہ یہ ایک علمی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں کہ مغربی تہذیب جن فکری بنیادوں پر کھڑی ہے، وہ ملحدانہ اور خلاف اسلام ہیں۔ مغربی تہذیب جن فکری اساسات اور نظریات پر مبنی ہے ان میں سے اہم چار ہیں:

① ہیومنزم (Humanism) ② سیکولرزم (Secularism)

③ سرمایہ داریت (Capitalism) اور ④ ایمپریسزم (Empiricism)

✿ 'ہیومنزم' کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنا خدا خود ہے، وہ خود مختار اور آزاد بلکہ مختار کل اور قادرِ مطلق ہے اور اپنی زندگی کے فیصلے خود کرسکتا ہے۔ کوئی بالاتر ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اس پر واجب ہو۔

✿ 'ہیومنزم' کا تصور چونکہ خدا کو رد کرتا تھا اور عیسائیت سے متصادم تھا (خواہ وہ برائے نام ہی تھی) لہٰذا ہیومنزم کے ردِعمل میں وہاں سیکولرزم کا نظریہ اُبھرا جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی خدا کو ماننا چاہتا ہے تو اپنی پرائیویٹ زندگی میں مان لے، لیکن اجتماعی زندگی سے اس خدا کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے یعنی اس خدا کو یہ حق نہیں کہ وہ معاشرے اور ریاست کے اجتماعی اُمور میں مداخلت کرے۔

✿ کیپٹل ازم یعنی نظامِ سرمایہ داری اصلاً ایک معاشی نظریہ تھا، لیکن یہ بتدریج طرزِ زندگی بن گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا میں بنیادی اہمیت مال و دولت کو حاصل ہے اور یہی عزت کا معیار ہے۔ لہٰذا ہر فرد کی ساری صلاحیت، وقت اور محنت صرف اسی پر صَرف ہونی چاہئے۔ اس تصور نے حبِ دنیا اور حبِ مال کو انسانی جدوجہد کا واحد ہدف بنا دیا اور زیادہ سے زیادہ دولت، سہولتوں اور آسائشوں کا حصول ہی مقصدِ زندگی ٹھہرا۔ بنک بیلنس، کار، کوٹھی، معیارِ زندگی یہی حاصل زندگی ہے۔ اس سے منطقی طور پر آخرت کی اہمیت اور اسکا تصور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

✿ ایمپریسزم کا مطلب یہ ہے کہ حق صرف وہ ہے جو تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہو سکے اور جو عقل و دلیل کے مطابق ہو۔ یہ اُصول مغرب میں سائنس و ٹیکنالوجی کی بنیاد بنا اور مابعد الطبیعیات (مذہبی و اخلاقی اصولوں) کے رد کا باعث ٹھہرا، کیونکہ اس سے وحی، ایمان اور عقیدے کی نفی ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مغربی تہذیب کے اِن بنیادی اُصولوں سے مغرب کا جو ورلڈ ویو (طرزِ حیات یعنی تصورِ انسان، تصورِ الٰہ اور تصورِ کائنات) اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا کوئی الٰہ نہیں، انسان کسی کا عبد نہیں، زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے، اسی کی فکر کرنی چاہئے (آخرت کی نہیں) اور حق صرف وہ ہے جو تجربے اور مشاہدے میں آسکے گویا وحی اور قرآن کی نفی! مطلب یہ کہ مغربی افکار کی رو سے ان کے ورلڈ ویو کا نتیجہ ہے: خدا کے تصور کا انکار، رسالت کے تصور کا انکار، آخرت کے تصور کا انکار اور وحی اور قرآن کا انکار یعنی ارکانِ ایمان کا انکار!

ان تصورات کے تحت ہی مغرب کی ساری زندگی اور زندگی کے مختلف شعبوں کا تانا بانا بُنا گیا۔ مثلاً وہاں کی سیاسی زندگی کا محور ہے: جمہوریت۔ جمہوریت کا مطلب ہے عوام کی خدائی۔ فرد چونکہ ہیومنزم کی رو سے آزاد، خود مختار بلکہ مختارِ مطلق ہے، اس لئے اس کے نمائندے بھی مختارِ مطلق ہیں۔ وہ جس پارلیمنٹ میں جا کے بیٹھیں گے، وہ بھی مختارِ مطلق ہوگی اور جو قانون چاہے بنا سکے گی، جس چیز کو چاہے حلال اور جس کو چاہے حرام قرار دے سکے گی۔ چنانچہ مغرب کے پارلیمانوں نے جوئے، شراب، زنا، لواطت وغیرہ کو جائز قرار دیا ہوا ہے۔

وہ ریاست اور معاشرے کو چلانے کے لئے جو بنیادی قانون بنا دے (یعنی آئین) وہ بھی مقدس و محترم ہے جس کی خلاف ورزی کی سزا موت ہے، کیونکہ وہ اس فرد کے نمائندوں نے بنایا ہے جو خود مختار اور مختارِ مطلق ہے، جو خود حق ہے اور خود حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا ہے، وہ اپنا خدا خود ہے، لہٰذا اس کے نمائندوں کا بنایا ہوا آئین بھی معیارِ حق و باطل ہے۔

یہ ہے مغربی جمہوریت اور جو کچھ ہم نے اس کی فکری اساسات اور خود اس کے بارے میں ابھی بیان کیا ہے، اس کے بعد اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ مغربی جمہوریت خلافِ اسلام ہے۔ یہ جن نظریات پر کھڑی ہے، وہ بھی ملحدانہ ہیں اور اس کا اپنا ڈھانچہ بھی خلافِ اسلام ہے۔

اسلامی جمہوریت؟

جب مغربی جمہوریت کو خلافِ اسلام کہا جائے تو اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ چلئے مان لیا کہ مغربی جمہوریت خلافِ اسلام ہے، لیکن ہم کون سا مغربی جمہوریت کو مانتے ہیں، ہم تو اسلامی جمہوریت کو مانتے ہیں۔ اب یہ اسلامی جمہوریت کیا ہے؟

اس کی حقیقت پر بھی غور کر لیجئے !

اہل مغرب نے چالاکی یہ کی کہ جب اسے مسلمان ملکوں سے مجبوراً نکلنا پڑا تو اس نے اقتدار جان بوجھ کر ان لوگوں کے حوالے کیا جو اس کی تہذیب کے رسیا اور اس سے مرعوب تھے۔ جو اس کی تہذیب، اس کی فکر، اس کے آئین، اس کے قوانین، اس کی جمہوریت، اس کی تعلیم کو مسلمان معاشرے میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے ایک پروردہ (مصطفیٰ کمال اتاترک) نے برسر اقتدار آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ خلافت کا خاتمہ کر دیا اور مغربی جمہوریت اپنے ہاں نافذ کر دی۔ یہی کچھ دوسرے مسلم ممالک میں ہوا۔

علماء نے یہ دیکھ کر کہ خلافت ختم ہوگئی، حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام پر عمل کرنا نہیں چاہتے، جو شریعت نافذ نہیں کرنا چاہتے اور اجتہاد کر کے نئے ماحول اور نئی ضرورتوں کے مطابق اسلام کا نیا سیاسی ڈھانچہ بنانا نہیں چاہتے تو اُنہوں نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ اگر یہ مسلمان حکمران (جو اندرونِ خانہ مغربی طاقتوں کے آلہ کار تھے، ان کی مدد ہی سے اقتدار میں آئے تھے اور ان کی تائید ہی سے اقتدار میں رہنا چاہتے تھے) کچھ بنیادی اسلامی باتوں کو مان لیں اور اسے آئین میں شامل کر لیں تو ہم اس جمہوریت کو قابل قبول سمجھ لیں گے۔ چنانچہ اُنہوں نے جدوجہد کر کے حکمرانوں سے کچھ باتیں منوالیں اور باقی باتیں منوانے اور جدوجہد کا راستہ کھلا رکھنے کے لئے اس نظام کے اندر رہ کر کام کرنا منظور کر لیا۔ اس طرح اس مغربی جمہوریت کو جو اصلاً ملحدانہ افکار پر مبنی تھی، مشرف بہ اسلام کر اور سمجھ لیا گیا اور اس پر ہم پاکستانی مسلمان پچھلے ساٹھ سال سے عمل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ 'اسلامی جمہوریت' اسلام کے سیاسی نظام کا صحیح مظہر ثابت ہوئی ہے؟ کیا اس سے معاشرہ اسلامی ہوا ہے؟ کیا اس کی مدد سے زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلام آیا ہے؟ کیا اس سے عوام کے مسائل حل ہوئے ہیں؟ کیا غریبوں کے حالات بدلے ہیں؟ کیا سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں اور نوابوں سے عوام کی جان چھوٹی ہے؟ کیا اسمبلیوں میں اسلامی کردار و اخلاق کے حامل لوگ پہنچے ہیں؟ کیا آئین سو فیصد اسلامی ہے؟ کیا سارے قوانین اسلام کے مطابق بنائے جا رہے ہیں؟ ان سب باتوں کا جواب ہاں میں دینا ممکن نہیں ہے۔

بلکہ حالات اس کے برعکس ہیں صرف دو شعبوں کی مثال لے لیجئے:

① ذرائع ابلاغ بے حیائی، عریانی اور فحاشی پھیلا رہے ہیں۔ میوزک اور ڈانس کو رواج دے رہے ہیں اور مغربی افکار و اقدار کو عام کر رہے ہیں اور مسلم معاشرے کی حیا، عفت، پاکیزگی اور اخوت پر مبنی اقدار کو تباہ کر رہے ہیں۔

② ایسے ہی ہمارا نظام تعلیم آج بھی مغرب کے غلام پیدا کر رہا ہے کیونکہ انگلش میڈیم عام ہے، بچوں کو نرسری سے انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور O اور A لیول کے امتحانات، آکسفورڈ کی غیر مسلم و غیر پاکستانی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں، پینٹ کوٹ نکٹائی کا یونیفارم، مخلوط تعلیم، تعلیم کو تجارت بنا دینا..... غرض ذہن سازی اور تعمیر شخصیت و کردار کا سارا ڈھانچہ مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ہے۔ یہی حال دوسرے شعبہ ہائے زندگی کا ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ ہماری جمہوریت 'اسلامی جمہوریت' ہے۔ یہ معاشرے کو اسلامی بنا رہی ہے اور اسے جاری رہنا چاہئے اور اسے خوب پھلنا پھولنا چاہئے، یہ محض خود فریبی ہے۔

ہماری اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ

① مغربی جمہوریت خلافِ اسلام ہے، کیونکہ مغربی تہذیب کے بنیادی اُصول و نظریات خلافِ اسلام ہیں۔

② مغربی جمہوریت سے مصالحت کر کے اور اس میں اسلام کے چند اُصولوں کی پیوند کاری سے ہمارے حکمرانوں اور بعض دینی رہنماؤں نے 'اسلامی جمہوریت' کا جو ملغوبہ تیار کیا تھا، وہ غیر مؤثر ثابت ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے میں اسلام نہیں آیا بلکہ مغربی تہذیب کا غلبہ ہوا ہے۔ سیاست ہی نہیں بلکہ سارے شعبہ ہائے حیات سیکولر ہو چکے ہیں۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت کے حوالے سے مذکورہ بالا حقائق کو تسلیم کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کے بعد عملاً اس مسئلے کا حل کیا ہو، یہ ہم آخر میں عرض کریں گے۔

❷ کیا پاکستان کا عدالتی نظام اسلامی ہے؟

جمہوریت کو کفر کہنے کے علاوہ مولانا صوفی محمد صاحب نے دوسری بات جو کہی ہے اور جو بظاہر بہت سے لوگوں کو چبھی ہے، وہ یہ ہے کہ پاکستان کا عدالتی نظام غیر اسلامی ہے۔ پاکستان کی ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ آئین کے مطابق فیصلے سناتی ہیں نہ کہ شریعت کے مطابق۔ لہٰذا

سوات کی قاضی کورٹس کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں وہیں سنی جائیں گی اور یہ کہ وہ پاکستانی ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کو شرعی عدالتوں کے لئے بطورِ اپیل کورٹ تسلیم نہیں کرتے اور نہ وکیلوں کے لئے کوئی کردار مانتے ہیں۔

بظاہر ان لوگوں کے لئے جنہوں نے موجودہ عدالتی نظام کو تسلیم کیا ہوا ہے اور وہ اسے اسلامی سمجھتے ہیں، یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اسے غیر شرعی کہہ کر رد کر دیا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب پاکستان بنا تو جن لوگوں نے پاکستان بنایا اور اُنہوں نے جو وعدے کئے اور جو لوگوں کا جذبہ اور توقعات تھیں، اس میں ہر آدمی یہ توقع کرتا تھا کہ پاکستان بنے گا تو ہر طرف ایمان کی بہار آجائے گی، اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں میں تبدیلی آئے گی اور ہر شعبے کی اسلامی تناظر میں تنظیم نو ہوگی، لیکن عملاً کچھ بھی نہ ہوا یا یوں کہہ لیجئے کہ بہت ہی تھوڑا ہوا اور برائے نام ہوا۔ قانونی اور عدالتی پہلو سے ذرا مندرجہ ذیل حقائق پر غور کیجئے:

۱۔ دینی قوتوں کے دباؤ ڈالنے، مہمیں چلانے اور جیلوں میں جانے کے نتیجے میں مجبوراً اس وقت کی مسلم لیگی حکومت نے قراردادِ مقاصد پاس کی اور اس میں آئین کے اسلامی پہلوؤں کا ذکر کیا، لیکن اسے آئین کا دیباچہ بنا دیا گیا اور آئین کے قابل نفاذ حصے میں شامل نہ کیا گیا۔ (جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں اسے آئین میں شامل کر لیا گیا، لیکن آئینی تشریحات کے جھرمٹ میں اس کی آپریشنل حیثیت پھر بھی مکمل طور پر بحال نہ ہوسکی)۔

۲۔ آئین میں یہ بات بھی تسلیم کی گئی کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا، لیکن اسے بھی پالیسی اُصولوں میں ڈال دیا گیا اور آئین کے قابل نفاذ حصے میں شامل نہیں کیا گیا۔

۳۔ انگریزوں کے بنائے ہوئے ہزاروں قوانین کا تسلسل جاری رکھا گیا۔

۴۔ اسلامی نظریاتی کونسل بنائی گئی، لیکن اس کا کردار ہمیشہ مشاورتی رکھا گیا اور اسے اختیارات سے محروم رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تناظر میں قانون سازی کے لیے اس کی طرف سے دی جانے والی تمام تجاویز درازوں میں بند پڑی رہ جاتی ہیں۔ اُنہیں دستوری تقاضے کے مطابق اسمبلی میں پیش نہیں کیا جاتا اور اگر کبھی پیش کر بھی دیا جائے تو اس کے مطابق قانون سازی نہیں کی جاتی۔

۵۔ لاء کالجز میں قانون کی تعلیم کے ساتھ شریعت وفقہ اور عربی زبان کی تدریس کا کوئی انتظام نہیں۔

۶۔ ججز کی اسلامی شریعت وقانون کی تربیت کا کوئی اہتمام نہیں۔

۷۔ وکلا کے پیشے میں جو غیر اسلامی اقدار ورسوم جڑ پکڑ چکی اور اس کا لازمی حصہ بن چکی ہیں، ان کے ازالے کے لئے کوئی کوششیں بروئے کار نہیں لائی جاتیں۔

۸۔ نچلی عدالتوں، ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں مفتی یا شریعت وفقہ کا کوئی ماہر بھی موجود نہیں ہوتا جو بوقتِ ضرورت عدالت کو شریعتِ اسلامی کے حوالے سے ماہرانہ رائے دے سکے۔

۹۔ ہمارا سارا قانونی ڈھانچہ 'برطانوی پروسیجرل لا' پر مشتمل ہے جو تاخیر کا سبب بنتا ہے جب کہ اسلامی اُصول یہ ہے کہ عدل میں تاخیر عدل کی نفی کے مترادف ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مقدمات کے فیصلے جلد ہوں اور اسلامی عدالتوں میں ہمیشہ فیصلے جلد ہی ہوتے ہیں، لیکن ہماری موجودہ عدالتوں میں صورت اس کے بالکل برعکس ہے۔ فوجداری عدالتوں کی حالت بھی الگ سے پتلی ہے، جب کہ ہماری دیوانی عدالتیں تو آدمی کو دیوانہ بنا کر رہتی ہیں ایک نسل مقدمہ درج کرائے تو بعض اوقات دوسری نسل کو فیصلہ سننا پڑتا ہے۔

۱۰۔ زمانہ قدیم کی طرح ہماری عدالتوں میں انصاف آج بھی بکتا ہے۔ عدالت میں کورٹ فیس جمع کروانا پڑتی ہے، عدالتی عملے کو بخشش دینا پڑتی ہے اور وکیلوں کی بھاری بھر کم فیسوں سے لوگ کنگال ہو جاتے ہیں۔

۱۱۔ یہ بات معروف ہے اور سب تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کی زیریں عدالتوں میں رشوت و کرپشن کی بھرمار ہے حتیٰ کہ اعلیٰ عدالتوں میں بھی ججوں کے کردار کے کمزور پہلو اکثر اخبارات میں زیر بحث آتے رہتے ہیں۔

۱۲۔ فیڈرل شریعت کورٹ قائم تو کی گئی ہے، لیکن وہاں علماء جج تعینات ہی نہیں کئے جاتے بلکہ ہائی کورٹ کے ججوں کو بطور سزا وہاں بھجوا دیا جاتا ہے اور عدالت کو اکثر غیر فعال رکھا جاتا ہے۔

۱۳۔ اعلیٰ عدالتوں کے جج اکثر وکلا میں سے لئے جاتے ہیں بلکہ اسلامی شریعت وفقہ میں مہارت ججوں کی تعیناتی کی شرائط میں سرے سے شامل ہی نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ وکلا ان تعلیمی مراحل سے گزرے ہوتے ہیں جن میں شریعت وفقہ کا علم و ادراک نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے،

لہٰذا یہی خرابی اِنہی وکلا کے ذریعے ججوں کی صورت میں برابر قائم رہتی ہے۔

۱۴۔ آئین میں اس امر کی کوئی ضمانت نہیں کہ ہماری اسمبلیوں میں ایسے لوگ بھی پہنچیں جو اسلامی شریعت اور فقہ کے ماہر ہوں تاکہ وہ قانون سازی میں فعال کردار ادا کرسکیں جب کہ عام ارکانِ اسمبلی کی تعلیم و تربیت ایسی نہیں ہوتی کہ وہ اسلامی تناظر میں قانون سازی کرسکیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آئین میں رکن اسمبلی بننے کے لئے جو شرائط مقرر کی گئی ہیں، ان پر کہیں بھی عمل نہیں ہوتا۔ نہ الیکشن کمیشن ان پر عمل کرواتا ہے اور نہ عدالتیں بلکہ حکومتیں بھی اس میں دلچسپی نہیں لیتیں۔

۱۵۔ پاکستان میں ۱۹۷۹ء سے حدود قوانین نافذ ہیں، لیکن ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ آج تک کسی چور کے ہاتھ اور کسی ڈاکو کے پاؤں نہیں کٹے، کسی زانی کو کوڑے نہیں لگے اور کسی زانی کو رجم نہیں کیا گیا حالانکہ معاشرے میں ان جرائم کی بھرمار ہے۔ ان قوانین کا البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ پولیس کے رشوت کے ریٹ بڑھ گئے ہیں۔

۱۶۔ انصاف دلانے میں پولیس کا بنیادی کردار ہوتا ہے، لیکن ہماری پولیس کا رویہ اتنا ایمان شکن ہے کہ الامان والحفیظ۔ کسی بھی پاکستانی سے اپنے شیر جوانوں کے بارے میں رائے لے لیجئے وہ کانوں کو ہاتھ لگائے گا۔

۱۷۔ ہماری جیلوں کا حال اتنا ناگفتہ بہ ہے کہ وہاں فرشتہ بھی چلا جائے تو عادی مجرم اور شیطان بن کر نکلتا ہے جبکہ جیلیں بھی نظامِ عدل کا ایک حصہ ہوتی ہیں اور ان کا کردار بھی صحیح ہونا ضروری ہے۔

ان ساری کوتاہیوں کی موجودگی میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا نظامِ عدل اسلامی ہے اور اسلامی تقاضوں پر پورا اُترتا ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ججوں کی اکثریت سیکولر، وکیلوں کی اکثریت مادّہ پرست اور ہماری عدالتوں کا مجموعی ماحول غیر اسلامی ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنے پر تیار نہیں اور اپنے نظامِ عدل کو اسلامی کہنے پر مصر ہیں تو کسی کو سیاہ کو سفید کہنے سے کون روک سکتا ہے؟ لیکن کسی کے سیاہ کو سفید کہنے سے سیاہ سفید ہو نہیں جاتا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم پچھلے ساٹھ سال میں اس عدالتی ماحول کے عادی ہوگئے ہیں اور سٹیٹس کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، ورنہ اگر ہم تجزیاتی یا تنقیدی نگاہ سے دیکھیں تو موجودہ عدالتی

ڈھانچے کو اسلامی کہنا بہت مشکل ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اس ڈھانچے کو کوئی اس لئے غیر اسلامی نہیں کہتا کہ ججوں کو قاضی اور وکیلوں کو مفتی کیوں نہیں کہا جاتا، یا ہائی کورٹ کو دار القضاء کیوں نہیں کہا جاتا؟ اور وکیل اور جج پینٹ کوٹ اور نکٹائی پہن کر عدالتوں میں کیوں آتے ہیں؟ یہ چیزیں غیر اہم ہیں۔ اصل بات وہ نقائص اور کوتاہیاں ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

لہٰذا اگر ہم موجودہ عدالتی نظام کو بدلنا چاہتے ہیں اور اسے اسلام کے مطابق بنانا چاہتے ہیں تو ان ساری خامیوں کو دور کرنا ہوگا۔ آئین کے قابل نفاذ حصے میں یہ لکھنا ہوگا کہ قرآن وسنت سپر آئین ہیں، قانون کا بنیادی مآخذ ہیں اور آئین کا کوئی جز قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ پارلیمنٹ اور انتظامیہ کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتیں جو قرآن وسنت کے خلاف ہو اور عدالتیں اس امر کی پابند ہونی چاہئیں کہ وہ فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کریں گی۔ پھر اسمبلیوں میں قانون سازی کو اسلام کے مطابق رکھنے کے لئے ضروری اقدامات کرنا ہوں گے جیسے عام ارکان کے لئے اخلاق وکردار کی کڑی شرائط اور اسلامی شریعت وفقہ کے ماہرین کے اسمبلی میں پہنچنے کا اہتمام جس کی کئی صورتیں ممکن ہیں، لیکن تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

قانون کی تعلیم کے ساتھ شریعت وفقہ اور عربی زبان کی تدریس کو لازمی کرنا ہوگا۔ موجودہ وکیلوں اور ججوں کی اسلامی شریعت وفقہ اور عربی زبان میں تربیت کا انتظام کرنا ہوگا۔ انصاف کی فوری فراہمی کے لئے موجودہ طریق کار کو بدلنا ہوگا۔ وکیلوں، پولیس اور جیل کے نظام میں مؤثر اصلاحات لاکر ان کا کردار بدلنا ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ ہمارا موجودہ عدالتی نظام غیر اسلامی ہے اور جب تک صحیح نیت کے ساتھ مندرجہ بالا خطوط پر اس کی مکمل اوور ہالنگ نہ ہو، اسے اسلامی کہنا محض مذاق ہوگا۔ عدالتی نظام میں یہ تبدیلیاں کون لائے گا اور یہ کیسے آئیں گی؟ اس سوال کا جواب ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس پر غور وتدبر فرمائیں۔ ہم نے اگر یہاں یہ بحث چھیڑ دی تو بات زیر بحث موضوع سے دور نکل جائے گی اور طویل بھی ہو جائے گی۔

③ مولانا صوفی محمد اور طالبان کا تصورِ شریعت

اس وقت تک جو گفتگو ہوئی، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر مولانا صوفی محمد کے الفاظ اور

اُسلوب سے صرفِ نظر کرلیا جائے تو ان کے اس موقف میں وزن ہے کہ مغربی جمہوریت مبنی بر کفر اور خلافِ اسلام ہے اور پاکستان میں مروج 'اسلامی جمہوریت' اسلامی تناظر میں اپنے نتائج کے حوالے سے غیر مؤثر اور ناکام ثابت ہوئی ہے اور اسی طرح پاکستان کا عدالتی نظام صحیح اسلامی تقاضوں پر پورا نہیں اُترتا۔ لیکن ان معاملات کی تفصیل میں جایا جائے اور نفاذِ شریعت کے حوالے سے مولانا صوفی محمد اور طالبان کی دوسری پالیسیوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ان کا موقف دین کی مین اسٹریم اور جمہور علماء کے متفقہ فیصلے اور اُمت کے مجموعی تعامل کے خلاف ہے خصوصاً تین معاملات میں:

① امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں قوت کے استعمال کے حوالے سے

جمہور علماء کا موقف صدیوں سے یہ ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام پرامن طریقے سے ہونا چاہئے اور طاقت استعمال کرنے کی اجازت صرف وہاں ہے جہاں کسی کے پاس اختیار ہو، اور جتنا اختیار ہو اتنی ہی طاقت استعمال کرنی چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حکومت اپنی یہ ذمہ داری پوری نہ کرے تو عامۃ المسلمین اور دینی جماعتوں اور اداروں کو حکومت کو توجہ دلانی چاہئے کہ وہ اپنے اس اہم دینی فریضے سے غفلت کا ارتکاب نہ کرے، اور جہاں تک ہو سکے، پرامن طریقے سے یہ کام خود بھی کرنا چاہئے، لیکن کسی گروہ کو حکومت کی طرح یہ اختیار بہر حال نہیں ہے کہ وہ قوت وطاقت سے یہ فریضہ انجام دینے لگے جیسے امر بالمعروف میں نفاذِ حدود یا نہی عن المنکر میں انسدادِ عریانی وفحاشی وغیرہ، کیونکہ جمہور علما کی رائے یہ ہے کہ ان کاموں کے لئے حکومتی اختیار ضروری ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسی صورت میں کئے جاسکتے ہیں جب کہ اس سے بڑا شر پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

② غیر صالح مسلم حکمران کے خلاف خروج کے حوالے سے

سیدنا حسین بن علیؓ اور سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ جیسے عظیم، متقی، پرعزم، شجاع، بارسوخ اور قرابت دارانِ رسول ﷺ کی جدوجہد، شہادت اور قربانی کے باوجود نظامِ سلطنت میں تبدیلی نہ آنے سے اُمت (خصوصاً اہل سنت) میں یہ رویہ اہمیت اختیار کرگیا کہ آئندہ سیاسی نظام کو قوت سے بدلنے کی بجائے پرامن طور پر تبدیل کرنے کا راستہ اپنایا جائے اور اسی پر پچھلے ساڑھے تیرہ سو سال سے اُمت کا عمل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غیر صالح مسلم حکمران کو قوت سے بدلنے کا

لازمی نتیجہ تخت یا تختہ کی صورت میں نکلتا ہے۔ نکلنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ 'شرعی جہاد' کے لئے نکلے ہیں جب کہ حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قانونی طور پر قائم مسلم حکومت کے خلاف 'بغاوت' فرو کر رہے ہیں لہٰذا وہ پوری قوت سے اُنہیں کچلنے اور امن و امان بحال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ 'خروج' کامیاب ہو جائے تو 'اسلامی انقلاب' اور ناکام ہو جائے تو 'بغاوت' بن جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں مسلمانوں میں باہم قتل و غارت ہوتی ہے، معاشرے میں بدامنی پھیلتی ہے، زندگی کی ساری سرگرمیاں تلپٹ ہوتی ہیں اور اس انتشار و اضطراب سے اُمت کا نقصان ہوتا ہے۔

اسی اُصول پر امت کا ماضی میں عمل رہا ہے اور اب بھی ہے۔ پاکستان میں ۹۰ فیصد یا اس سے بھی زیادہ چونکہ اہل سنت رہتے ہیں جن کے علماء کا یہی موقف ہے لہٰذا مولانا صوفی محمد، طالبان اور قبائلی علاقوں کے دوسرے مسلح گروہوں کا موقف جمہور اُمت کے خلاف ہے۔ جس کی زندہ مثال لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا معاملہ ہے کہ وفاق المدارس کے جید علماء اور اس کی مرکزی قیادت کا فیصلہ یہی تھا کہ اُنہوں نے مولانا عبدالعزیز برادران سے کہا تھا کہ آپ کے مقاصد اور اہداف صحیح ہیں، لیکن آپ کا طریق کار صحیح نہیں ہے۔

اور خصوصاً آج کل کے سیاسی دور میں جب ہر ملک کا آئین پرامن تبدیلی کا راستہ کھولتا ہے خواہ وہ انتخابات کی صورت میں ہو یا سول نافرمانی کی صورت میں، بشرطیکہ عامۃ المسلمین کی حمایت آپ کو حاصل ہو۔ اس وجہ سے آج کل جمہور علما پرامن تبدیلی ہی کی حمایت کرتے ہیں خواہ مسلم حکمران کتنے ہی غیر صالح اور غیر مقبول کیوں نہ ہوں، چنانچہ مشرف جیسے سیکولر، ظالم اور جابر ڈکٹیٹر کے خلاف بھی جس نے پاکستان کو امریکہ کے ہاتھوں تقریباً بیچ ہی دیا اور وہ بھی صرف اپنے اقتدار کی قیمت پر، جمہور علما نے کبھی اس کے خلاف اُمت کو ہتھیار اُٹھانے کی اجازت کا فتویٰ نہیں دیا اور وہ اب بھی حکومت پاکستان اور اس کی فوج کے خلاف طالبان اور دیگر گروہوں کی جدوجہد کو 'شرعی جہاد' قرار نہیں دیتے۔

③ نفاذ شریعت کی حکمتِ عملی اور ترجیحات کے حوالے سے

بلاشبہ مسلم حکمرانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں شریعت نافذ کریں، لیکن نفاذِ شریعت کی حکمت عملی کیا ہونی چاہئے اور اس کی ترجیحات کیا ہونی چاہئیں؟ اس حوالے سے بھی مولانا صوفی محمد اور طالبان کا موقف جمہور علما کے خلاف ہے۔ جمہور علما کے نزدیک نفاذِ شریعت کا کام

ذہن سازی کے بعد، تدریج کے ساتھ اور عصری تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کرنا چاہئے جب کہ مولانا صوفی محمد اور طالبان کا اُسلوب یہ ہے کہ وہ اس نازک اور حساس کام کو الٹ طریقے سے اور غلط ترجیحات کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔

دین کی کس کتاب میں یہ لکھا ہے کہ نفاذِ شریعت کا آغاز نفاذ حدود اور کوڑے مارنے سے کرنا چاہئے؟ مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اگر مجھے حکومت مل جائے تو پہلے دس سال تطہیر افکار اور اصلاحِ قلوب وعقول کا کام کروں گا۔

اسی طرح مولانا مودودی نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد لکھا تھا کہ اُفراد کی تربیت اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر موجودہ حالات میں نفاذِ حدود مناسب نہیں۔

اور نفاذِ شریعت کی یہ کون سی ترجیح ہے کہ اس کی ابتدا کالی پگڑی پہننے کے وجوب سے کی جائے یا حجاموں کی دکانیں، بچیوں کے سکول اور سی ڈی کی دکانیں جلانے سے کی جائے؟ نفاذِ دین کی ترجیحات کی صحیح بنیاد یہ ہے کہ پہلے تطہیر افکار اور اصلاحِ قلوب وعقول کے لئے سنجیدہ محنت کی جائے، لوگوں کی دینی تعلیم وتربیت کی جائے اور ابتدا ترغیب سے ہو نہ کہ ترہیب سے، سدِ ذریعہ کے طور پر پہلے برائی کے رستے بند کئے جائیں، لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں، دین پر عمل کو لوگوں کے لئے پرکشش بنایا جائے، معاشرے میں باہم اخوت ومحبت پیدا کی جائے تاکہ وہ دینی احکام پر عمل کرنے اور خیر کے راستے پر چلنے میں ایک دوسرے کا دست وبازو بنیں، ان سب مراحل کے بعد کہیں ترہیب اور سزا کا سوچا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر حکمران نفاذِ شریعت میں سنجیدہ اور مخلص ہوں تو مولانا صوفی محمد اور پاکستانی طالبان کے تصورِ شریعت کے معاملے سے نمٹا جا سکتا ہے اور اس کی آسان صورت یہ ہے کہ تحریکِ نفاذِ شریعت محمدی اور پاکستانی طالبان کے رہنماؤں سمیت پاکستان کے سارے مسالک کے اہم اور معتدل مزاج علماء کا ایک 'شریعت بورڈ' بنا دیا جائے جو پاکستان میں نفاذِ شریعت کی حکمتِ عملی اور ترجیحات کا تعین کرے اور اس کی متفقہ سفارشات پر عمل کر لیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کیونکہ مولانا صوفی محمد اور طالبان بیک وقت حکومت اور سارے علما سے لڑائی مول لینا نہیں چاہیں گے اور اگر بفرضِ محال وہ من مانی پر اُتر بھی آئیں تو عوام کی حمایت سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران عموماً اور صوبے اور مرکز میں اس

وقت موجود حکمران خصوصاً (اے این پی اور پی پی پی) نفاذِ اسلام کے حوالے سے مخلص ہیں ہی نہیں۔ یہ تو مجبوری اور صوفی محمد اور طالبان کے دباؤ میں ان کے کم سے کم مطالبات ماننا چاہتے ہیں بلکہ وعدے کر کے ان سے بھی حیلے بہانے مکر جانا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی ایک تلخ لیکن ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قبائلی علاقوں میں نفاذِ شریعت کی علمبردار مجاہدین کی بعض تنظیمیں بھی اس کام کے لئے مخلص نہیں، کیونکہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں اپنے گھس بیٹھئے اور مداخلت کار داخل کر دیئے ہیں اور ان کو اُنہوں نے مجاہدین کی تنظیموں میں بھی داخل کر دیا ہے اور بعض کو ڈالروں سے خرید لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے ان قبائلی علاقوں میں مجاہدین اور طالبان کے بعض غیر مخلص لوگ اور گروہ حکومتِ پاکستان اور اس کے اداروں کو زک پہنچانا چاہتے ہیں اور امن قائم ہونے دینا یا اسلام کا نفاذ ان کا درد سر ہی نہیں۔ ان کی ڈوریاں تو کہیں اور سے ہلائی جارہی ہیں اور ہلانے والوں کے مقاصد یہ ہیں کہ عالم اسلام کے اس عظیم ایٹمی ملک کو سیاسی اور معاشی عدم استحکام اور فکری انتشار کا شکار کر دیا جائے، اسے ایٹمی قوت نہ رہنے دیا جائے اور اسے بھارت کا غلام بنا دیا جائے..... اللہ ہمیں ان کی مکروہ سازشوں سے بچائے، پاکستان کی حفاظت فرمائے اور ہمارے حکمرانوں کو اپنے ذاتی مفادات کے چنگل سے نکل کر ملک وملت کے مفاد میں فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❹ سوات اور طالبانائزیشن: حل کیا ہے؟

یہ موقف اختیار کرنے کے بعد کہ مولانا صوفی محمد اور طالبان کی یہ رائے صحیح ہے کہ مغربی جمہوریت کفر ہے، پاکستان کی 'اسلامی جمہوریت' غیر مؤثر اور ناکام ثابت ہو چکی ہے اور پاکستان کا نظامِ عدل اسلامی تقاضے پورے نہیں کرتا۔ لیکن دوسری طرف امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں قوت کے استعمال، غیر صالح مسلم حکمران کے خلاف جہاد کرنے اور نفاذِ شریعت کے طریق کار اور اس کی حکمتِ عملی اور ترجیحات کے تعین کے حوالے سے مولانا صوفی محمد اور طالبان کی پالیسیاں جمہور علماء اور جمہور مسلمانوں کی متفقہ رائے کے خلاف ہیں جنہیں وہ بزورِ بازو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا حل کیا ہو؟ صحیح فیصلے پر پہنچنے کے لئے ہمیں حالات کے تمام پہلو ایک نظر میں سامنے رکھنا ہوں گے، چنانچہ ہماری طالب علمانہ رائے

میں اس وقت منظر نامہ یہ ہے کہ

① یہودیوں کے ساتھ مل کر امریکہ پچھلی ڈیڑھ دہائی سے یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ عالم اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کو نہ صرف پر امن سازشوں کے ذریعے بلکہ قوت سے بھی ملیا میٹ کر دینا ہے تاکہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا راستہ روکا جا سکے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں تو وہ پہلے دن سے کر رہے ہیں اور ان کی اسلام اور مسلم دشمنی کا گواہ خود قرآن کریم، نبی کریم ﷺ کی صحیح احادیث اور اُمت کی پوری تاریخ ہے۔ صلیبی جنگوں، عالم اسلام پر حملہ کر کے اسے غلام بنانے، ان کے اجتماعی ادارے تباہ کر کے اور ان کی مغربی فکر و تہذیب کے مطابق تجدید کر کے مسلمانوں کے دل و دماغ فتح کرنے اور اُنہیں اپنی فکر و تہذیب کا رسیا بنانے، پھر مجبوراً مسلم ملکوں کو تھوڑی بہت آزادی دے کر مسلم حکمرانوں کو اپنا کاسہ لیس بنانے، اُنہیں مسلم عوام سے لڑانے اور اُنہیں سیاسی، معاشی، سماجی طور پر کمزور اور غیر مستحکم کرنے کی سازشوں کے تسلسل میں جب اُنہوں نے دیکھا کہ ان کی ساری رکاوٹوں اور سازشوں کے باوجود کچھ مسلمان ملک بیدار ہو گئے ہیں اور مضبوط ہو گئے ہیں تو اُنہوں نے قوت استعمال کرنے اور ابھرتے ہوئے مسلم ممالک کو تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلی باری عراق کی تھی، دوسرا ہدف افغانستان بنا اور اب تیسری باری پاکستان کی ہے۔

یہاں امریکہ پہلے فوج کو برسر اقتدار لایا پھر حکمران آرمی جنرل کو جیب میں ڈال کر افغانستان کا تورا بورا بنایا، پھر جب وہ انتہائی غیر مقبول ہو کر کام کا نہ رہا تو ایک 'جمہوری حکومت' کو آگے لانے کے لئے سیکولر پی پی پی اور آمر میں سمجھوتہ (NRO) کروایا اور اب پی پی پی کی حکومت امریکی آلہ کار کے طور پر کام کر رہی ہے اور فوج بھی امریکہ اور حکومت کا ساتھ دے رہی ہے۔ گویا اگر یہی حالات جاری رہتے ہیں تو پاکستان کی سالمیت شدید خطرے میں ہے اور پاکستان کے موجودہ سیاسی اور فوجی حکمران خود اس کے وجود کے لئے سیکورٹی رسک بن چکے ہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے کوئی راست نکالیں۔

② پاکستان کو کمزور کرنے، توڑنے اور اس کی ایٹمی صلاحیت ختم کرنے کے لئے یہ بھی امریکی حکمت عملی کا حصہ ہے کہ نیٹو فورسز کے دباؤ کے ساتھ ساتھ اس نے نہ صرف پاکستان کے اندر اپنے ڈرون طیاروں سے حملے شروع کر رکھے ہیں بلکہ امریکی سی آئی اے، بھارتی را،

اسرائیلی موساد اور افغان خاد نے مل کر پاکستان کے قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں مداخلت کار بھجوا دیئے ہیں جو پاکستان اور پاکستانی فوج کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہے ہیں اور اس کے شہروں اور سیکورٹی فورسز کے خلاف خودکش حملے کر رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُنہوں نے بڑی محنت و کوشش سے پاکستان خصوصاً اس کے قبائلی علاقے میں مخابرات اور جاسوسی کا منظم نیٹ ورک قائم کرلیا ہے اور طالبان اور دیگر مسلح تنظیموں میں اپنے افراد داخل کردیئے ہیں اور ان میں سے بعض کی قیادتوں کو ڈالروں سے فتح کرلیا ہے اور وہ اُنہیں پاکستان اور اس کی فوج کے خلاف لڑا رہے ہیں۔

③ پاکستان کے سیاسی حکمران اور اس کی فوج یہ سب کچھ جانتے ہیں، لیکن اپنے اقتدار کے لئے اور حبِ جاہ و مال کے لئے امریکی غلامی قبول کئے ہوئے ہیں اور بے حمیتی سے یہ سب کچھ برداشت کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کے لئے جب وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو اس وقت ان کو ایک راستہ یہ نظر آتا ہے کہ قبائلی علاقوں میں جو مسلح تنظیمیں پاکستان اور اسلام سے مخلص ہیں، وہ ان کو اپنے ساتھ ملائیں تاکہ مداخلت کاروں کا راستہ روکا جا سکے۔ جب حکومت قبائلی علاقوں میں اس طرح کا کوئی معاہدہ کرتی ہے تو نہ صرف امریکہ اور اس کے اتحادی اس کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ پاکستان میں اس کے تنخواہ یافتہ اور لے پالک آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ ان میں الیکٹرانک میڈیا کے بعض ٹی وی چینل، پرنٹ میڈیا کے بعض اخبارات، حکومت کے اندر بیٹھے ہوئے بعض اہم وزرا مخصوص مفادات کے حامل بعض سیاسی گروہ، کئی مذہبی سکالر، بعض دانشور، ادیب اور صحافی، این جی اوز اور حقوقِ انسانی کی بعض تنظیمیں شامل ہیں۔ گویا یہ بھی ایک خاصا بڑا نیٹ ورک ہے جو امریکی سی آئی اے پاکستان میں کامیابی سے چلا رہی ہے۔ ہم نے فتنے سے بچنے کے لئے کسی کا نام نہیں لیا، لیکن واقفانِ حال تو انہیں جانتے ہیں۔ اور ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ عام لوگ بھی ان کو اب آہستہ آہستہ پہچاننے لگے ہیں اور وہ وقت ان شاء اللہ دور نہیں جب کافروں کے یہ دریوزہ گر اور ان کے حمایتی پوری طرح بے نقاب ہو کر عوامی نفرت اور غضب کا شکار ہو جائیں گے۔

اس مضمون کے تیسرے حصے میں ہم نے مولانا صوفی محمد اور طالبان کے جس تصورِ شریعت کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کا نقطہ نظر ان معاملات میں واقعی انتہا پسندانہ، جمہور علما کی

رائے کے خلاف اور پاکستانیوں کی اکثریت کے لئے ناقابل قبول ہے۔ لیکن ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ طالبان اتنے طاقتور ہیں کہ وہ پاکستانی فوج کو شکست دے کر اسلام آباد یا کراچی پر قبضہ کر سکتے ہیں، لیکن اس کا امکان خدانخواستہ اس لئے نظر آتا ہے کہ امریکہ، بھارت، اسرائیل اور افغانستان چاہتے ہیں کہ ایسا ہو اور اس کے لئے وہ طالبان کو اسلحہ بھی دیں گے، پیسہ بھی دیں گے، نفری بھی دیں گے بلکہ بالواسطہ طریقے سے غالباً اب بھی وہ یہ سب کچھ اُنہیں دے رہے ہیں۔

اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا ہے تو وہ ایک تیر سے کئی شکار کریں گے۔ نفاذِ شریعت کو بدنام کریں گے تاکہ وہ دنیا میں قابل قبول نہ رہ سکے۔ پاکستانی فوج اور حکومت کو طالبان سے لڑا کر دونوں کو کمزور کریں گے۔ عام پاکستانیوں کے دل میں مجاہدین سے نفرت کو کامیابی سے اُبھار سکیں گے اور یہ تو ان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کہ وہ ممبئی جیسا ایک اور جعلی واقعہ بھارت میں کر کے بھارتی افواج کو پاکستان کی مشرقی سرحد پر لے آئیں گے۔ یوں پاکستان اور پاکستانی فوج مشرق، شمال اور مغرب تینوں طرف سے گھیرے میں لے لی جائے گی اور خاکم بدہن امریکہ، اسرائیل اور بھارت اسے توڑنے اور اس کی ایٹمی صلاحیت ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

☆

ہمارے اس تجزیے کی رو سے پاکستان میں طالبانائزیشن کے غلبے کا حقیقی خطرہ موجود ہے۔ لیکن کیا اس صورتِ حال کا کوئی حل نہیں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ابھی تک دیوار سے نہیں لگے اور اگر مندرجہ ذیل تین نکاتی حکمتِ عملی اختیار کی جائے تو یہ مسئلہ ان شاء اللہ حل ہو جائے گا اور پاکستان اور پاکستانی قوم مزید طاقتور ہو کر اُبھرے گی، ان شاء اللہ!

① امریکی غلامی کا خاتمہ

حکومت فوج، پارلیمنٹ، ساری سیاسی جماعتوں، صوبوں اور عوام کے تعاون سے فوری طور پر دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ سے باہر نکل آئے۔ امریکیوں اور نیٹو سے ساری سہولتیں واپس لے۔ قبائلی علاقوں پر ڈرون حملوں اور مداخلت کاروں کو پاکستان کی سالمیت کے خلاف دشمنی قرار دے کر اُنہیں قوت سے روک دے اور ان کا مقابلہ کرے۔ یہ صرف ذہنی غلامی، مرعوبیت اور اخلاقی کمزوری ہے کہ حکومت یہ نہیں کر پا رہی، ورنہ اگر حکومت یہ فیصلہ کرے تو

عوام اس کا بھرپور ساتھ دیں گے اور بھوکے رہ کر بھی لڑیں گے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ، نیٹو اور بھارت سے جنگ کی نوبت نہیں آئے گی، صرف بہادری سے امریکی غلامی کا جوا گردن سے اُتارنے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ ایران نے امریکہ کی ڈکٹیشن قبول کرنے سے انکار کر دیا تو امریکہ نے ایران کا کیا بگاڑ لیا؟ پاکستان کا بھی وہ کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ یہ صرف اعصاب کی جنگ ہوتی ہے جو ہم ہمت کریں تو جیت سکتے ہیں۔ اگر حکومت پاکستان یہ فیصلہ کرلے تو مخلص طالبان اور دیگر مسلح گروپ یقیناً اس کا ساتھ دیں گے، سوائے پکے ہوئے کچھ لوگوں کے، جن سے نمٹا جاسکتا ہے۔

② پاکستان میں صدقِ دل سے نفاذ اسلام

طالبانائزیشن کو روکنے کی دوسری تیر بہدف تدبیر یہ ہے کہ نہ صرف قبائلی علاقوں بلکہ پاکستان میں خلوص، صدقِ دل اور انتہائی سنجیدگی سے شریعت نافذ کر دی جائے۔ اس کے لئے ہم اوپر تجویز پیش کر چکے ہیں کہ سارے دینی مسالک کے معتمد اور معتدل علما پر مشتمل ایک 'شریعہ بورڈ' بنا دیا جائے جو نفاذِ شریعت کی حکمتِ عملی اور ترجیحات کا تعین کرے۔ اس بورڈ کی متفقہ سفارشات کو ان شاء اللہ ساری پاکستانی قوم تسلیم کرے گی۔ سارے مسالک کے علماء پر مشتمل اس طرح کا ایک پلیٹ فارم 'ملی مجلس شرعی' کے نام سے پہلے سے لاہور میں کام کر رہا ہے، اس کو بھی توسیع دی جاسکتی ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ امریکہ اور مغرب پاکستان میں نفاذ اسلام کا یہ کام نہیں ہونے دے گا اور ہمارے حکمران بھی ساٹھ سال کی برائے نام اور کمزور 'اسلامی جمہوریت' کے جس ڈھکوسلے سے دل بہلا رہے ہیں اور دینی قائدین بھی سیاسی قیادت کے مزے لوٹ رہے ہیں اور عملاً سیکولر ہو چکے ہیں، ان کے لئے بھی شریعت کا حقیقی نفاذ ہضم کرنا مشکل ہے، لیکن یہ 'کرلو یا موت کو قبول کرو' Do or Die والا مسئلہ ہے۔ اس میں آپشن کوئی نہیں۔ یا سچے دل سے پاکستان میں اسلام نافذ کیجئے یا پھر طالبان کا اقتدار اور وحشی اسلام قبول کرنا پڑے گا یا پھر امریکی اور بھارتی غلامی میں ایک غیر ایٹمی مریل سا پاکستان قبول کر لیجئے جس میں خانہ جنگی ہو رہی ہوگی اور وہ جلد یا بدیر بھارت میں ضم ہو جائے گا (خاکم بہ دہن) اور یہی امریکہ اور بھارت چاہتے ہیں۔

③ پاکستان کے دین پسند شہریوں کا لانگ مارچ

تیسری اور آخری تدبیر طالبانائزیشن سے بچنے کی یہ ہوسکتی ہے کہ اگر حکومت پاکستان ٹس

سے مس نہ ہو اور موجودہ سٹیٹس کو برقرار رکھنے پر مصر رہے (جس کا لازمی نتیجہ پاکستان کی تباہی ہو گا) تو پھر آخری حل یہ ہے کہ اس ملک کے مخلص دینی عناصر متحد ہو کر سڑکوں پر آجائیں اور لانگ مارچ اور دھرنے کے ذریعے حکومت کو بدل دیں یا حکومت کو مذکورہ بالا کردار انجام دینے پر مجبور کر دیں۔ اس کے لئے دین اور پاکستان کا درد رکھنے والے سارے افراد، گروہوں، تحریکوں، اداروں، مذہبی اور سیاسی جماعتوں، دینی مدرسوں، کالجوں یونیورسٹیوں کے طلبہ، سول سوسائٹی کے پروفیشنلز (ڈاکٹرز، پروفیسرز، انجینئرز، وکلا، صحافی، ادیب، دانشور.....) غرض دین کا درد رکھنے والا ہر پاکستانی اور اس کے اسلامی تشخص کو بچانے کی خواہش رکھنے والا ہر فرد اور ہر ادارہ اس کے لئے نکل کھڑا ہو۔

یہ سیل بے پناہ جب سڑکوں پر نکل آئے گا تو کوئی اس کا راستہ نہیں روک سکے گا۔ ہم ایوب خان اور بھٹو کے خلاف تحریکوں اور حال ہی میں نواز شریف کے لانگ مارچ کی صورت میں اس کے تین کامیاب تجربے دیکھ چکے ہیں۔

اور اگر ہم یہ بھی نہیں کریں گے تو چوتھا کوئی آپشن نہیں۔ پھر آسمان والے ہم پر روئیں گے اور زمین والے ہم پر نوحے پڑھیں گے، کیونکہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ جو قوم خود کو نہیں بدلتی خدا بھی اس کے حالات نہیں بدلتا اور پھر تباہی اس کا مقدر ہوتی ہے۔ لیکن ہم اپنی قوم سے مایوس نہیں ہیں، اس کی مٹی میں ابھی کچھ نم باقی ہے اور اگر کسان کھرپی لے کر آ گیا تو پھر ایک فصل اُگے گی، تر و تازہ جو تنومند ہو گی، بہترین پھل لائے گی، مؤمنوں کے دل اس سے ٹھنڈے ہوں گے اور کفار کے دل اس سے جلیں گے۔ وما ذلك على الله بعزيز (اور یہ اللہ کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ہے) بشرطیکہ ہم میں سے ہر فرد اپنے حصے کا کام کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔

(ڈاکٹر محمد امین)

ڈاکٹریٹ کی تکمیل پر ہدیہ تبریک

ہم مجلّہ 'محدث' کے فاضل مدیر جناب حافظ حسن مدنی کو پنجاب یونیورسٹی سے علومِ اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کی تکمیل اور نوٹیفکیشن پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں دینِ متین کی مزید خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔

منجانب اَراکین وانتظامیہ ماہنامہ 'محدث' لاہور

حدیث وسنت

محمد رفیق چودھری

غامدی صاحب اور انکارِ حدیث ⑥

حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص وتحدید کا مسئلہ

غامدی صاحب کے انکارِ حدیث کا سلسلہ بہت طولانی ہے۔ وہ فہم حدیث کے لیے اپنے من گھڑت اُصول رکھتے ہیں جن کا نتیجہ انکارِ حدیث کی صورت میں نکلتا ہے۔ وہ حدیث اور سنت کی مسلمہ اصطلاحات کا مفہوم بدلنے کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ حدیث کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس کے ثبوت کے لیے اپنی طرف سے اجماع اور تواتر کی شرائط عائد کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں فرمایا تھا۔ حدیث وسنت کے بارے میں اُن کے ہاں کھلے تضادات بھی پائے جاتے ہیں۔

انکارِ حدیث کے حوالے سے وہ حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تخصیص وتحدید واقع ہونے کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں لکھتے ہیں کہ

''قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اُس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کرسکتا۔ دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ اس کی آیاتِ بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔''

(میزان: ص۲۵، طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء لاہور؛ اُصول ومبادی: ص۲۴ طبع فروری ۲۰۰۵ء لاہور)

اپنے اس دعوے کے بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ

''حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوے فہم اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے، کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔''

(میزان: ص۳۵، طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء لاہور؛ اُصول ومبادی: ص۳۶، طبع فروری ۲۰۰۵ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک

① دین میں ہر چیز کے ردّ وقبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا۔
② حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید وتخصیص نہیں ہوسکتی۔
③ اگر قرآن کے کسی حکم میں حدیث سے تحدید وتخصیص مان لی جائے تو اس سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ اور مشکوک ہوجاتا ہے۔

① کیا دین میں ہر چیز کے ردّ وقبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ دین میں ہر چیز کے ردّ وقبول کا فیصلہ صرف قرآن کی آیاتِ بینات کی روشنی میں ہوگا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن مجید ہی ان کے اس دعوے کی تردید کردیتا ہے۔ وہ ہر معاملے کے فیصلے کے لیے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں دین کے ہر معاملے کا فیصلہ قرآن اور حدیث وسنت کی روشنی میں کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (النساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اُن کی جو تم میں سے اہل اختیار ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہوجائے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔''

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے کہ اہل ایمان کے درمیان کسی بھی مسئلے کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے اللہ ورسول کی طرف رجوع کیا جائے گا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کے ہر معاملے میں ردّ وقبول کا فیصلہ قرآن اور حدیث وسنت کی روشنی میں ہوگا، نہ کہ صرف قرآن کی روشنی میں۔

چنانچہ غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے:

''رد إلی اللہ والرسول کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی امر میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو

پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو نبی ﷺ کی سنت کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔''

(تدبر قرآن: جلد۲، ص۳۲۵، طبع ۱۹۸۳ء لاہور)

پھر مولانا اصلاحی نے اس آیت کی مزید تفسیر کرتے ہوئے قرار دیا ہے کہ

''اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قانونِ اسلامی کے مرجع کی حیثیت سے کتاب اللہ کی طرح سنتِ رسول ﷺ کی حیثیت بھی مستقل اور دائمی ہے۔ اس لیے کہ فرمایا کہ فردّوہ الی اللہ والرسول (پس اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ) ظاہر ہے کہ یہ ہدایت نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی تک کے لیے محدود نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ اس اختلاف کے پیدا ہونے کا غالب امکان تو حضورؐ کی وفات کے بعد ہی تھا اور آیت خود شہادت دے رہی ہے کہ اس کا تعلق مستقبل ہی سے ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپؐ کی سنت ہی ہے جو آپؐ کے قائم مقام ہوسکتی ہے۔'' (ایضاً: جلد۲، ص۳۲۶، طبع ۱۹۸۳ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی کا یہ دعویٰ کہ دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا، ایسا بے اصل اور غلط دعویٰ ہے جو کہ قرآنِ مجید کے بھی خلاف ہے، سنت کے خلاف ہے، اجماعِ صحابہؓ و اجماعِ اُمت کے بھی خلاف ہے اور اُن کے بھی خود اپنے اُستاذ امام کے موقف کے بھی خلاف ہے۔

② کیا حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص ہوسکتی ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی بالکل غلط ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآنِ مجید کے بہت سے احکام کی تحدید اور تخصیص ہوئی ہے اور اہل علم کے ہاں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حدیث سے قرآنی حکم کی تحدید کی مثالیں

حدیث کے ذریعے قرآنِ مجید کے کئی احکام میں تحدید واقع ہوئی ہے۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

① اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ

اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا﴾ (النساء:۳۴)

''اور جن بیویوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو اُنہیں سمجھاؤ، ان سے ہم بستری چھوڑ دو اور (اس پر نہ مانیں تو) اُنہیں مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف الزام تراشی نہ کرو۔ بے شک اللہ سب سے برتر اور بہت بڑا ہے۔''

اس آیت کے الفاظ: واضربوھن (اور ان بیویوں کو مارو) مطلق تھے اور یہ مارنا ہر طرح کا مارنا اور زخمی کرنا ہوسکتا تھا، لیکن ایک حدیث کے ذریعے قرآن کے اس مطلق حکم میں یہ تحدید (تقیید) ہوگئی ہے کہ صرف ایسی مار جائز ہے جو اتنی تکلیف دہ نہ ہو کہ اُس سے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«فاضربوھن ضربا غیر مبرح» ..... (صحیح مسلم حدیث:۲۹۵۰)

''پس تم ان کو اتنا مار سکتے ہو جو ایسا تکلیف دہ نہ ہو کہ اس سے انکے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تحدید ہوسکتی ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ غامدی صاحب نے خود اپنے 'اُصولِ حدیث' کے خلاف حدیث کے ذریعے قرآن کی مذکورہ آیت کے حکم وَاضْرِبُوْهُنَّ (اور ان بیویوں کو مارو) کی تحدید مانی ہے کہ اس سے مراد صرف ایسی سزا ہے جو پائیدار اثر نہ چھوڑے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' اور 'قانونِ معاشرت' میں لکھتے ہیں کہ

''نبی ﷺ نے اس کی حد 'غیر مبرح' کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کہ پائیدار اثر چھوڑے'' (میزان: ص۴۲۳، طبع سوم ۲۰۰۸ء، لاہور؛ قانونِ معاشرت، ص۳۰، طبع اوّل، مئی ۲۰۰۵ء، لاہور)

دین کے بارے میں ایسے کھلے تضاد کا حامل ہونا صرف غامدی صاحب ہی کو زیب دیتا ہے۔

② تحدید کی دوسری مثال یہ ہے:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوْا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ (البقرۃ:۲۲۲)

''اور وہ آپؐ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہیں وہ ایک گندگی ہے لہٰذا اس میں بیویوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں، اُن کے قریب نہ جاؤ۔''

اس آیت میں یہ حکم ہے کہ فاعتزلوا النساء فی المحیض (پس تم بیویوں سے اُن کے حیض کی حالت میں الگ رہو) یہ الگ رہنا ایک مطلق حکم ہے جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ایسی حالت میں بیویوں سے الگ تھلگ رہو، اُن کو الگ مقام پر رکھو، ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دو اور ان سے میل جول نہ رکھو۔ لیکن اس بارے میں صحیح احادیث سے قرآن کے اس مطلق حکم کی تحدید ثابت ہے کہ ایسی حالت میں بیویوں سے صرف مباشرت منع ہے، اس کے سوا سب کچھ جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تحدید ہوسکتی ہے۔

خود غامدی صاحب حدیث کے ذریعے قرآن کے اس مطلق حکم کی تحدید کو مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی حوالے سے ایک حدیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''انہی (سیدہ عائشہؓ) سے روایت ہے کہ ہم میں سے کوئی حیض کی حالت میں ہوتی اور رسول اللہ ﷺ اس کے قریب آنا چاہتے تو ہدایت کرتے کہ حیض کی جگہ پر تہ بند باندھ لے، پھر قریب آجاتے۔'' (صحیح بخاری حدیث:۲۹۶)

(میزان: ص۴۳۳، طبع سوم، مئی ۲۰۰۸ء؛ قانونِ معاشرت: ص۴۳، طبع اوّل، مئی ۲۰۰۵ء، لاہور)

اس طرح غامدی صاحب پہلے اپنا یہ اُصولِ حدیث بتاتے ہیں کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تحدید نہیں ہوسکتی اور پھر اپنے اس اُصول کی خود ہی خلاف ورزی کرتے ہوئے قرآن کے احکام کی تحدید حدیث ہی سے ثابت کردیتے ہیں۔

❁ حدیث کے ذریعے کسی قرآنی حکم میں تخصیص واقع ہونا اہل علم کے نزدیک ثابت ہے۔ اس کی پہلی مثال یہ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ...﴾ (النساء:۱۱)

''اللہ تمہارے اولاد کے بارے میں تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ (وراثت میں) ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا جائے......''

اس آیت سے واضح ہے کہ اولاد ہر حال میں اپنے والدین کے ترکے کی وارث ہوگی اور بیٹے کو بیٹی سے دگنا حصہ ملے گا۔ لیکن صحیح حدیث میں ہے کہ

«لا يرث القاتل شيئًا» (سنن ابوداؤد، کتاب الدیات، حدیث ۴۵۶۴)

''قاتل وارث نہیں ہوسکتا۔''

اس لیے اگر کوئی بد بخت لڑکا اپنے باپ کو قتل کردے گا تو مذکورہ حدیث کے حکم کے مطابق اپنے مقتول باپ کی میراث سے محروم ہوجائے گا۔

قرآن کا حکم عام تھا کہ ہر بیٹا اپنے باپ کے ترکے کا وارث ہوگا مگر حدیث نے قاتل بیٹے کی تخصیص کردی کہ وہ اپنے باپ کے ترکے کا وارث نہیں ہوسکتا۔ یہی اسلامی شریعت ہے اور اہل علم کا اسی پر اتفاق اور اجماع ہے کہ قاتل کو مقتول کی وراثت سے محروم کیا جائے گا۔ اس طرح حدیث نے قرآن کے ایک حکم عام میں تخصیص کردی ہے۔

☆ تخصیص کی دوسری مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ:۲۷۵)

''اور اللہ نے تجارت کو حلال اور سُود کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

مذکورہ آیت ہر طرح کی تجارت کو حلال ٹھہراتی ہے، کیونکہ اس میں عموم پایا جاتا ہے۔ لیکن صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی حدیث ہے کہ

«إن الله ورسوله حرَّما بيع الخمر والميتة والخنزير والأصنام»

''بے شک اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے شراب، مردہ جانور، خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے۔'' (صحیح بخاری: کتاب البیوع، حدیث ۲۲۳۶)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں شراب، مردہ جانور، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے۔ اب اگر قرآن کے حکم کو دیکھا جائے تو ہر قسم کی تجارت حلال ہے، کیونکہ قرآنی الفاظ میں عموم ہے۔ لیکن قرآن کے اس حکم عام میں حدیث کے ذریعے یہ تخصیص ہوئی ہے کہ شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے اور قرآن میں جس تجارت کے حلال ہونے کا ذکر ہے اس میں شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت شامل نہیں ہے۔

اب اگر غامدی صاحب کے بتائے اس اُصولِ حدیث کو مانا جائے کہ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص نہیں ہوسکتی تو پھر مذکورہ صحیح حدیث کا انکار کرنا پڑے گا اور اسلام میں شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت بھی حلال ہوجائے گی جو غامدی صاحب کی خود ساختہ شریعت تو ہوسکتی ہے مگر وہ اسلامی شریعت نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم میں تحدید و تخصیص کو نہ ماننا ''محض سوے فہم اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔''

③ کیا حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص ہونے سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے:

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اگر حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تخصیص یا تحدید مان لی جائے تو اس سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآنی احکام میں تخصیص اور تحدید واقع ہونے سے قرآنِ مجید کا فرقان ہونا قطعاً مشتبہ نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے قرآنی احکام کی وضاحت ہو جاتی ہے اور ان کا صحیح مدعا اور منشا معلوم ہو جاتا ہے جیسا کہ اُوپر کی مثالوں سے واضح ہے۔

رہی یہ بات کہ قرآن کو 'میزان' کہا گیا ہے تو یہ بالکل ایک غلط اور بے اصل بات ہے۔ قرآن نے اپنی صفت میزان کہیں بھی بیان نہیں فرمائی۔ اُمت کے معتمد اور ثقہ اہل علم میں سے کسی نے کبھی بھی میزان کو قرآن کی صفت قرار نہیں دیا۔

اسی طرح حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم میں تخصیص یا تحدید ہونے سے اُس کا فرقان ہونا کسی طرح مشتبہ یا مشکوک قرار نہیں پاتا۔ فرقان بلاشبہ قرآن کا صفاتی نام ہے اور قرآن سے ثابت بھی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں بہت سے احکام مجمل طور پر بیان ہوئے ہیں اور حدیث ان کی تفصیل اور تشریح کرتی ہے۔ حدیث کے ذریعے قرآن کے بہت سے مجمل احکام کی وضاحت ہوتی ہے اور اس سے قرآن کا فرقان ہونا کسی طرح مشتبہ یا مشکوک نہیں ہو جاتا۔ یہ غامدی صاحب کا محض وہم ہے اور وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔

محدث کے سالانہ خریداروں سے گزارش

سال ۲۰۰۷ء، ۲۰۰۸ء میں مدتِ خریداری ختم ہونے پر محدث کے خریداروں کو بذریعہ پوسٹ کارڈ اطلاع دی گئی لیکن بعض خریداران نے ابھی تک تجدید نہیں کروائی۔ ایسے خریدار جنہوں نے دسمبر ۲۰۰۷ء کے بعد زرِتعاون جمع نہیں کرایا، ان سے گزارش ہے کہ وہ جلد از جلد زرِسالانہ بھیج کر تجدید کروائیں۔ یادہانی کی عدمِ پیروی کی صورت میں ہم ان کے نام ڈاک فہرست سے بادلِ نخواستہ کاٹنے پر مجبور ہوں گے۔ مزید برآں جن خریداران کو دسمبر ۲۰۰۸ء اور مارچ ۲۰۰۹ء سے مدتِ خریداری ختم ہونے کے پوسٹ کارڈ بھیجے گئے ہیں، وہ بھی پہلی فرصت میں ادائیگی فرمائیں۔ اگر خدانخواستہ آئندہ محدث کی خریداری جاری نہیں رکھنا چاہتے تو تب بھی بذریعہ خط یا فون دفتر 'محدث' کو فوری مطلع فرمائیں۔ شکریہ! منیجر 'محدث' 03334244434

نقطہ نظر

حافظ محمد زبیر

تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدیؐ اور علماء کی ذمہ داریاں

۱۹۲۳ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کی صورت میں خلافتِ اسلامیہ کا ادارہ ختم ہوگیا۔ ملحد و سیکولر ترک رہنما مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی ایک تقریر کے دوران آسمان کی طرف اپنا مکا لہراتے ہوئے خدا کو دکھایا اور مسلمانوں میں پہلی دفعہ خدا کے تصور کو ریاست سے جدا کرنے کی بدعت کا آغاز فرمایا۔ مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے کفریہ عقائد و نظریات پر مبنی قانون سازی نے مملکتِ ترکی کو خلافتِ اسلامیہ سے 'جمہوریہ کفریہ' کی طرف دھکیل دیا۔

اللہ کے رسول ﷺ کے دور سے لے کر ۱۹۲۳ء تک خلافتِ اسلامیہ کسی نہ کسی شکل میں کہیں نہ کہیں قائم رہی تھی، لیکن اب کی بار اُمتِ مسلمہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چشمِ فلک نے یہ المناک منظر بھی دیکھا کہ اُمتِ مسلمہ خلافت کے مقدس ادارے سے محروم ہوگئی۔

دوسری طرف خلافتِ اسلامیہ سے جمہوریہ کفریہ کی طرف ترکی کے اس سفر اور خلافت سے محرومی نے اُمتِ مسلمہ کے ہر خطے میں بے چینی اور اضطراب کی لہر پیدا کر دی۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب مصر، برصغیر پاک و ہند سمیت دنیا کے دوسرے خطوں میں خلافتِ اسلامیہ کی بحالی کے لیے مختلف تحریکوں کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۲۳ء سے تا حال اُمت میں یہ فکر پھول کی خوشبو کی مانند پھیلتی ہی چلی گئی ہے کہ خلافت کے ادارے کی دوبارہ بحالی مسلمانوں کی اولین اور اَشد ذمہ داری ہے اور اس عالم ارضی میں مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے۔

چنانچہ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد ہی علمائے کرام، دینی جماعتوں کے قائدین اور صالح فکر کے حامل مفکرین نے پاکستان کو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی ریاست بنانے کے لیے آئینی و قانونی جدوجہد کا آغاز کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی،

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالحامد بدیوانی، مولانا ظفر احمد انصاری، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور سردار عبدالرب نشتر رحمہم اللہ اجمعین وغیرہ کی کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۴۹ء میں قرار دادِ مقاصد منظور ہوئی اور ریاست جمہوریہ پاکستان نے اس قرار داد کو اپنے آئین کا مقدمہ بناتے ہوئے کلمہ شہادت کا اقرار کیا اور بظاہر مسلمان ہوگئی۔

قرار دادِ مقاصد کے حصول کے بعد بھی علما کی طرف سے نفاذِ اسلام کی آئینی و قانونی کوششیں جاری رہیں۔ ۱۹۵۰ء ہی کے لگ بھگ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آئین سازی کے لیے سرکاری سطح پر ایک بورڈ قائم کیا گیا جس کا نام 'بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ' رکھا گیا۔ اس بورڈ مین اگرچہ اس وقت کے نامور دانشور اور علماء مثلاً سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد انصاری اور مفتی جعفر حسین وغیرہ شامل تھے، لیکن حکومت نے اس بورڈ کی پیش کی گئی سفارشات کو قانون سازی میں کوئی اہمیت نہ دی۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جب بھی علما یا دینی حلقوں کی طرف سے حکمران طبقے سے اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا جاتا تو ان کی زبانوں پر ایک ہی کلمہ استعجاب جاری ہو جاتا: کون سا اسلام نافذ کیا جائے!؟ حنفی، بریلوی، شافعی، اہل تشیع کا، یا اہل حدیث کا؟ چنانچہ جنوری ۱۹۵۱ء میں ملک کے نامور شیعہ، بریلوی، دیوبندی اور اہلحدیث علمائے کرام کی ایک جماعت نے بائیس نکات پر مشتمل ایک متفقہ فارمولا منظور کیا۔ اس قرارداد پر دستخط کرنے والوں میں مولانا مودودی، سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد انصاری، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا عبدالحامد بدیوانی، پیر مانکی شریف اور مفتی جعفر حسین وغیرہ رحمہم اللہ جیسی نامور شخصیات شامل تھیں۔

علمائے حق کی جانب سے پاکستان کے قانون اور آئین کو اسلامی بنانے کی یہ کوششیں تقریباً نصف صدی تک جاری رہیں☆ بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ ہو یا ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ، اسلامی نظریاتی کونسل ہو یا وفاقی شرعی عدالت، ان سب اداروں کا قیام علمائے کرام کی اسی

☆ علماء کی اس طویل جدوجہد کا تذکرہ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اپنے ایک مقالے میں کیا ہے جو ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں کی کتاب 'علم اُصولِ فقہ: ایک تعارف' کی تیسری جلد میں شامل ہے۔

جدوجہد کا مرہونِ منت تھا۔ ایک وقت تھا جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل میں ملک کے جید علماء شامل ہوتے تھے اور اَب صورت اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ بہر حال اکثر و بیشتر ایسا ہوا کہ علما کی تحریک کے نتیجے میں حکومتِ وقت کی طرف سے جب بھی قانون و آئین کو اسلامی بنانے کے لیے کچھ ادارے قائم ہوئے یا بورڈ بنائے گئے، یا تو وہ ملکی سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے یا اگر علماے حق کو ان اداروں میں نمائندگی کا موقع دیا بھی گیا تو ان کی بیش بہا تحقیقات کو ردّی کی ٹوکری کی نذر کر دیا گیا۔ اصحابِ اقتدار کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے آہستہ آہستہ علما کے ایک طبقے میں بھی مایوسی اور بددلی اس قدر گھر کر گئی کہ وہ نفاذِ اسلام کے لیے پرامن آئینی و قانونی جدوجہد سے بھی کٹ کر ہمہ تن قرآن و حدیث کی تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ یہ تو تصویر کا ایک رخ ہوا۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ افغانستان میں روس کے خلاف جہاد کے نتیجے میں پاکستان کے مذہبی حلقوں میں جذبہ جہاد کی آبیاری ہوئی۔ اس جہاد کے نتیجے میں افغانستان میں روس کو شکست ہوئی اور طالبان کی حکومت قائم ہو گئی۔ نائن الیون کے بعد افغانستان پر امریکی حملہ ہوا، امارتِ اسلامیہ افغانستان ختم ہو گئی اور امریکہ کے خلاف طالبان کی طویل گوریلا جنگ کا آغاز ہوا۔ وزیرستان، مالاکنڈ ڈویژن، سوات اور صوبہ سرحد کے کئی ایک دوسرے حصوں سے مجاہدین کی ایک بہت بڑی تعداد جہادِ افغانستان میں شریک ہونے کے لیے افغانستان گئی، لیکن وہاں کے طالبان کو اس وقت کے مخصوص حالات کے اعتبار سے افراد کی بجائے حکمتِ عملی اور جدید اسلحہ کی زیادہ ضرورت تھی۔ پس افغانستان کے خاص حالات کے پیش نظر پاکستانی مجاہدین کی اتنی بڑی تعداد طالبان کے لیے ایک اضافی بوجھ تو بن سکتی تھی، لیکن مفید نہ تھی۔ چنانچہ طالبان قیادت سے مشورے کے نتیجے میں یہ مجاہدین واپس پاکستان آ گئے۔

دوسری طرف امریکہ نے جب پرویز مشرف حکومت پر القاعدہ، طالبان اور عرب مجاہدین کو پکڑوانے میں تعاون کے لیے دباؤ ڈالا تو پرویز مشرف کی حکومت نے امریکی ڈالروں کے حصول کی خاطر سوات اور مالاکنڈ ڈویژن کے افغانستان سے واپس آنے والے مقامی مجاہدین

کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کرنا شروع کر دیا جو کہ امریکہ کو اصلاً مطلوب بھی نہ تھے☆

اس عمل کے نتیجے میں صوبہ سرحد کے اس خطے کی عوام میں حکومت کے خلاف شدید نفرت پر مبنی ردِعمل پیدا ہوا اور پرویز مشرف کی ظالم حکومت کے خلاف انتقامی جذبات نے ایک مقامی تحریک جہاد کی صورت اختیار کر لی۔ اقتدار کے نشے میں مست فوجی ڈکٹیٹر نے اس تحریک کو دبانے کے لیے معصوم سواتی عوام پر وحشیانہ بمباری کروائی۔ رہی سہی کسر وزیرستان اور قبائلی علاقوں میں امریکی جہازوں کے ڈرون حملوں اور اس پر حکومتِ وقت کی مجرمانہ خاموشی نے پوری کر دی۔ آئے روز امریکہ کے ڈرون حملوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہی جا رہا ہے اور یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ امریکہ کے ان حملوں کے جواب میں سوائے وائٹ ہاؤس کی خدمت میں درخواستیں پیش کرنے کے ہماری افواج یا حکومتِ وقت میں کوئی حکمتِ عملی اختیار کرنے یا کاروائی کرنے کی ہمت یا جرات نہیں ہے۔ صلیبی ٹیکنالوجی کا اس قدر رعب وخوف ہمارے جرنیلوں کے دلوں میں بٹھا دیا گیا اور امریکی ڈالروں کی ایسی محبت ہمارے حکمرانوں کے جسم و جان میں پلا دی گئی ہے کہ اگر امریکہ پاکستان کے صوبہ سرحد کی طرح چاروں صوبوں پر بھی ڈرون حملے شروع کر دے تو شاید پھر بھی حکومت پاکستان کی رِٹ (writ) چیلنج نہیں ہو گی لیکن اگر سوات کے عوام حکومت کے ظالمانہ عدالتی نظام سے نجات حاصل کرنے کے لیے عدل و انصاف مہیا کرنے والی عدالتوں کے قیام پر اصرار کریں تو حکومت پاکستان کے لیے رِٹ (writ) کا مسئلہ فوری پیدا ہو جاتا ہے۔

وزیرستان کے جہاد کی حقیقت بھی یہی ہے کہ وہاں بھی عرب مجاہدین کو پکڑوانے کے لیے پرویز مشرف حکومت کی طرف سے فوجیں چڑھائی گئی جس کے نتیجے میں وہاں کے قبائلیوں نے اپنے جان و مال کے تحفظ کی خاطر حکومت پاکستان کے خلاف دفاعی جہاد شروع کیا جس نے اپنوں کے خون کے قصاص کی خاطر بالآخر اقدامی قتال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کی تفصیلات ہم نے اپنے ایک مضمون میں بیان کی ہیں جو کہ ماہنامہ 'الاحرار' لاہور کے جنوری،

☆ اس بارے میں مزید معلومات کے لیے: مراد کرناز کی عبرت ناک داستان بعنوان ''جب مجھے تین ہزار ڈالر میں امریکیوں کے ہاتھ فروخت کیا گیا'' ماہنامہ اردو ڈائجسٹ فروری ۲۰۰۹ء میں ملاحظہ فرمائیں۔

اپریل، مئی اور جون ۲۰۰۸ء میں چار اقساط میں شائع ہو چکا ہے۔ سونے پر سہاگہ یوں ہوا کہ حکومتِ پاکستان نے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں پر امریکی ڈرون حملوں کے بعد اپنی خفت مٹانے کے لیے اپنی فضائی فورسز کو معصوم قبائلی عوام کو شہید کرنے پر لگا دیا۔ قبائلی علاقوں اور مالاکنڈ ڈویژن میں امریکہ اور ان کے حواری پاکستانی حکومت کے خلاف دفاعی جہاد کی اس تحریک نے کئی ایک طالبان گروہوں اور جہادی تحریکوں کو جنم دیا اور بڑھتے بڑھتے اس تحریک نے اقدامی قتال، خودکش حملوں، قتال فرضِ عین اور امریکہ نواز حکومتوں کی تکفیر کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔

اس دفاعی جہاد کے اقدامی قتال کے مرحلے میں داخل ہونے کے پیچھے مقامی افراد کے ردِ عمل کے علاوہ ایک اہم سبب یہ طرزِ فکر بھی ہے کہ پاکستان میں بھی ایک حقیقی اسلامی ریاست کا قیام صرف عسکری طریقے ہی سے ممکن ہے۔ سوات میں اُبھرتی ہوئی طالبان تحریک، پرویز مشرف کی امریکہ نواز حکومت کی ظالمانہ پالیسیوں کا ردِ عمل ہے۔ پاکستان کے مذہبی حلقوں کے خلاف حکومتوں کی مسلسل ظالمانہ پالیسیوں نے یہ فکر عام کر دیا ہے کہ مذہبی حلقے کو امریکہ کی غلامی کے علاوہ پاکستان کے ظالم حکمرانوں سے بھی نجات حاصل کرنی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ آزادی ہر مسلمان، مسلمان تو کیا ہر انسان کا ایک بنیادی حق ہے۔

آج صوفی محمد کی تحریک کو کبھی رحمٰن ملک، کبھی زرداری، کبھی الطاف حسین اور کبھی جنرل کیانی یہ الزام دیتے نظر آتے ہیں کہ یہ تحریک لوگوں پر اسلام کے نام پر جبراً اپنے انتہا پسندانہ نظریات مسلط کرنا چاہتی ہے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے بعد سے اب تک تقریباً ساٹھ سال کے طویل عرصے میں چند افراد پر مشتمل حکومتی ٹولے یا مارشل لاء ڈکٹیٹروں نے ملک کے مذہبی حلقوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ آئین و قانون کے نام پر عوام الناس پر ان کی مرضی کے خلاف اپنے ملحدانہ اور کفریہ نظریات کو کبھی 'انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء' کے نام پر اور کبھی 'تحفظِ حقوقِ نسواں بل' کی آڑ میں جبراً نافذ کرنا یا بے گناہ پاکستانی عوام کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے ہاتھوں چند ڈالروں کے عوض بیچ دینے کو کیا آزادی و مساوات کا نام دیا

جائے؟ بیروزگاری کے عفریت، معاشی بدحالی، فقر و فاقہ کے نتیجے میں خودکشیاں، غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ، جرائم کی کثرت، عدالتوں میں انصاف کا بحران، پولیس اور لینڈ مافیا کا ظلم و ستم، امن و امان کی تباہی، انٹرنیٹ اور کیبل کی صورت میں عریانی و فحاشی کا سیلاب، وڈیرہ شاہی، جاگیردارانہ نظام، کرپشن، رشوت خوری، چوری و ڈکیتی، زنا و گینگ ریپ، عورتوں کو زندہ دفن کر دینا، غیر انسانی طبقاتی تقسیم، منشیات و شراب کی سرعام فروخت، گلی کوچوں اور سڑکوں پر ڈاکوؤں کی قتل و غارت اور عامۃ الناس پر ظلم و ستم کی انتہا کرنے والی لسانی و علاقائی تنظیمیں..... کیا پاکستان کی عوام یہ سب کچھ چاہتی ہے؟ اگر نہیں تو اس کو اُن پر مسلط کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟ حکومت کا ظالمانہ اور کرپشن پر مبنی ناقص نظام یا طالبان؟ پاکستانی معاشرے پر ان گندگیوں کو کس نے جبراً مسلط کیا ہے؟ حکومتِ وقت نے یا مولانا صوفی محمد نے؟

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام یا نفاذِ شریعت یا قیام عدلِ اجتماعی یا ظالم حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنے کے حوالے سے مذہبی طبقے اپنی جدوجہد کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو مناہج میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک منہج تو عسکری ہے جو حکومت کی ظالمانہ پالیسیوں کا ثمر ہے اور دوسرا منہج اس مقصد کے حصول کی خاطر ہر اس جدوجہد پر مشتمل ہے جو پاکستان کے آئین و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہو۔

پاکستان کے قیام کے فوراً بعد علماء اور دینی تحریکوں نے نفاذِ شریعت کے لیے دوسرے منہج کو ہی اختیار کیا۔ ہمارے خیال میں اس طریقۂ کار کو اختیار کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ پاکستان کے حکمران اس وقت کے علما کی نظر میں معیاری مسلمان تھے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر پاکستان کے حکمران کافر ہوتے تو پھر بھی علماء اسلامی ریاست کے قیام کے لیے دوسرے منہج ہی کو اختیار کرتے، کیونکہ پہلا منہج ناقابل عمل اور ناممکن ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں برصغیر پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد علماء نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس خطہ ارضی میں مسلمانوں کی حکومت دوبارہ بحال کرنے کے لیے عسکری طریقۂ کار ممکن نہیں رہا تو اُنہوں نے اگلی ایک صدی (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء) تک مسلمانوں کی آزادی اور ایک اسلامی ریاست کے قیام

کی خاطر اپنی جدوجہد کا رخ آئینی، قانونی اور سیاسی طریقہ کار کی طرف پھیر دیا۔ لال مسجد کے واقعے کے بعد علماء کے بیانات سے ایک دفعہ پھر یہ بحث واضح ہوگئی ہے کہ اُنہوں نے اپنے حق میں نفاذِ شریعت کے لیے پُرامن جدوجہد ہی کو اصل منہج قرار دیا ہے۔ اگرچہ علماء وہ پُرامن جدوجہد کر رہے ہیں یا نہیں؟..... یہ ایک سوالیہ نشان ضرور باقی رہ جاتا ہے!!

سوات میں تحریک نفاذ شریعت محمدی کے بارے میں اس وقت مذہبی حلقے دو حصوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ ایک تو حکومتی و سیاسی ملاؤں کا ٹولہ ہے جو حکومت وقت کی تائید و خوشنودی حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ درباری مولویوں اور گدی نشینوں کا یہ طبقہ کبھی بھی نہیں چاہے گا کہ توحید کے متوالوں کی حکومت قائم ہو اور مذہبی استحصال پر مبنی ان کا کاروبار و تجارت متاثر ہو۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بعض سرکاری مولویوں نے مولانا صوفی محمد کے بعض فتاویٰ پر شدید جرح کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مولانا صوفی محمد نے پارلیمنٹ کو کفریہ قرار دیا ہے تو جمہوری نظام کے کفر ہونے میں راسخون فی العلم کے ہاں کہاں دو آرا پائی جاتی ہیں؟ جمہوری نظام کفر تو ہے، لیکن اس کفر کے ساتھ رویہ یا معاملہ کیسا ہونا چاہیے؟ اس کفریہ نظام میں رہتے ہوئے اس کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کیسے ہو؟ کفریہ نظام کی تبدیلی کے لیے اس میں شامل ہو کر اس کے خلاف جدوجہد کی جائے مثلاً بذریعہ انتخاب یا کسی حکومتی ادارے مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کی سرپرستی کے ذریعے آئین، قانون اور نظام میں تبدیلی لائی جائے یا اس سے باہر رہتے ہوئے انتخابات کے علاوہ احتجاج کا رستہ اختیار کیا جائے؟ یہ موضوع درحقیقت علما کے مابین محل اختلاف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مولانا صوفی محمد کے اس بیان سے کسی فتویٰ کی اہمیت سامنے آئی ہے اور حکمران طبقے نے اپنے خلاف کفر کے فتویٰ میں جو دفاعی انداز اختیار کیا ہے، وہ قابل تعجب ہے۔ ہمارے خیال میں یہ وہ موقع ہے جبکہ علماے پاکستان کو متحد ہو کر پارلیمنٹ، حکومت وقت اور جمہوری نظام کی شرعی حیثیت کو فتویٰ کی زبان سے واضح کرنا چاہیے اور اس میں مقصد لوگوں کو خروج یا بغاوت پر آمادہ کرنا نہ ہو بلکہ

۱۔ اس سے اصل مقصود الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے اس بحث کو اُجاگر کرنا ہو کہ کیا قرآن وسنت کی روشنی میں حکمران طبقے، موجودہ جمہوری نظام اور حکومتی پالیسیوں میں واقعتاً کچھ مسائل ایسے ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ تکفیر کے مستحق ٹھہرتے ہیں تاکہ حکومت وقت کی خارجہ و داخلہ پالیسیوں میں اپنے عوام کے بنیادی حقوق کے پاس، عدل و انصاف کی فراہمی اور اسلامی تعلیمات کے لحاظ کی طرف مثبت میلان ورجحان پیدا ہو۔

۲۔ اس اجتماعی فتوے سے ایک دوسرا اہم تر مقصد یہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ ایک اسلامی فلاحی ریاست کے قیام اور نفاذِ شریعت کے لیے وکلا کی چیف جسٹس بحالی تحریک یا نواز شریف کے لانگ مارچ کی طرز پر سارے ملک میں ایک پرامن عوامی احتجاجی تحریک برپا کی جا سکتی ہے۔

ہمارے مخلص مذہبی طبقے بالخصوص کا المیہ یہ ہے کہ نفاذِ شریعت یا قیامِ خلافت کے لیے ان کے ذہن میں کوئی منہج ہے تو وہی خروج یا بغاوت کا طریقہ کار ہے جو فی زمانہ ریاست اور کسی عوامی جماعت کے مابین بہت زیادہ عدمِ توازن کی وجہ سے ناقابل عمل ہونے کے ساتھ ساتھ ناممکن بھی ہو چکا ہے۔ اور اس منہج کے تیزی سے پھیلنے کا بنیادی سبب ہمارے حکمرانوں کا حد سے بڑھتا ہوا ظلم ہے۔ اگر جذبات کی بات ہوتی تو شاید ہم بھی کہتے کہ حجاج کی نسل سے تعلق رکھنے والے معصوم بچیوں، عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کے ان قاتلوں کی سزا یہ ہے کہ مال روڈ پر لٹا ڈال کر ان پر ٹینک چڑھا دیے جائیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم کر کیا سکتے ہیں؟

اس وقت جذبات سے زیادہ عقل کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں نفاذِ شریعت کی عسکری تنظیموں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہاں عمل، فکر سے پچاس کلومیٹر آگے دوڑ رہا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فکر وعمل کا دوڑ مقابلہ ہو رہا ہو۔ اس وقت اُمت مسلمہ کو امریکہ اور اس کے حواریوں سے یہ جنگ جیتنے کے لیے جسم و جان سے زیادہ فکر ونظر کے استعمال کی ضرورت ہے۔ نفاذِ شریعت کے لیے ایک طویل جدوجہد کے بعد مولانا صوفی محمد کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ پاکستان میں عسکریت یا خروج کے رستے کامیابی حاصل نہیں کی

جاسکتی۔ ہمارے خیال میں اگر لال مسجد کے واقعے میں بھی ایک پرامن احتجاجی تحریک کی صورت میں نفاذِ شریعت کا مطالبے کو آگے بڑھایا جاتا تو بہت بہتر تھا۔

اس وقت لوہا گرم ہے اور اس کو چوٹ لگانے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ علماے پاکستان کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مالاکنڈ میں شریعت کے نفاذ کے تحفظ اور سارے ملک میں نظامِ عدل کے قیام کی خاطر ایک پرامن احتجاجی تحریک کا آغاز کریں۔ سیاسی پارٹیاں اپنے عہدوں اور وکلا انگریزوں کے بنائے ہوئے کالے قوانین کے تحفظ کی خاطر قربانیاں دے سکتے ہیں، مظاہرے کر سکتے ہیں، دھرنے دے سکتے ہیں تو علما اور طلبا، دین اسلام، ظلم وستم کے خاتمے اور عدل و انصاف کے قیام کی خاطر کیوں ایسا نہیں کر سکتے؟

ہمارے ہاں عام طور پر مفتیانِ کرام مجاہدین کے حق میں قتال کی فرضیت کے فتوے جاری کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ شاید اُنہوں نے اپنے حصے کا فرض ادا کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امریکہ، برطانیہ، اسرائیل، انڈیا اور ان کے حواریوں کے ظلم و بربریت کے خلاف قتال فرضِ عین ہے، فرضِ عین ہے، فرضِ عین ہے، اگر یہ صفحات اجازت دیتے تو ہم ستر مرتبہ اس جملے کو دہراتے۔ ہمیں اختلاف قتال کی فرضیت میں نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ کس پر فرض ہے؟ ہمارے نزدیک یہ قتال اسلامی ریاستوں کے سربراہان، حکمرانوں اور اصحابِ اقتدار پر فرض ہے اور علما، طالبانِ دین اور مصلحین پر فرضِ یہ ہے کہ اپنے ملک کے حکمرانوں اور اصحابِ اقتدار کو اس قتال پر ہر آئینی، احتجاجی، قانونی، لسانی، علمی، اخلاقی اور تحریری ذرائع و وسائل، اخبارات، رسائل و جرائد، الیکٹرانک میڈیا، جلسے جلوسوں، دھرنوں، سیمینارز اور کانفرنسوں کے انعقاد، اجتماعی مباحثوں اور مکالموں اور عوامی دباؤ کے ذریعے مجبور کریں اور اگر پھر بھی حکمران اس فریضے کی ادائیگی سے انکار کریں تو مذکورہ بالا تمام پرامن کوششوں کے ذریعے، ان حکمرانوں کی معزولی اور ان کی جگہ اس عہدے کی اہلیت رکھنے والے اصحابِ علم وفضل کی تقرری، علما اور داعیانِ حق کا بنیادی فریضہ ہوگا تاکہ ریاستی سطح پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے عالمی ظلم کے خلاف قتال کا فریضہ سرانجام دیا جا سکے۔

ہمارے نزدیک علما کا جہاد یہ ہے کہ علمائے کرام، دینی جماعتیں اور ان کے کارکنان اور دینی مدارس کے طلبہ، وزیرستان اور دوسرے قبائلی علاقوں میں ہونے والے وحشیانہ ڈرون حملوں اور قبائلی علاقوں میں پاکستانی افواج وفضائیہ کی پرتشدد کاروائیوں کے خلاف ملک گیر سطح پر پرامن جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کریں۔ عوام الناس کی رائے ہموار کریں۔ سٹریٹ پاور بڑھائیں۔ اسلامی نظام عدلِ اجتماعی کے نفاذ تک وکلا کی طرح مسلسل مظاہرے کریں۔ امریکہ کی حمایت ختم کرنے کے لیے حکومتِ وقت کے خلاف دھرنے دیں۔ بے غیرت، بے دین اور ظالم حکمرانوں کی معزولی کی خاطر پرعزم لانگ مارچ کریں۔ پاکستان کی پاک سرزمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے ہر پرامن جدوجہد اختیار کریں اور نتائج اللہ کے حوالے کردیں۔

المیہ یہ ہے کہ پاکستان کا مذہبی طبقہ اس طرح کی پرامن جدوجہد کے ذریعے اسلام، جہاد اور مجاہدین کی جو مدد کرسکتا ہے، وہ تو کرتا نہیں ہے بس ساری توانائی اس پر ہی خرچ ہوجاتی ہے کہ ایک عام سپاہی یا فوجی کافر ہے یا مسلمان؟ عام مسلمان پر قتال فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ مدارس میں بیٹھ کر جہاد کے حق میں فرضِ عین ہونے کے فتاوی جاری کرنے سے یہ نفسیاتی تسکین تو کسی مفتی صاحب کو حاصل ہوسکتی ہے کہ اُنہوں نے جہاد کی خاطر بہت گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں، لیکن اگر وہی مفتیان حضرات جہاد اور مجاہدین کے حق میں حکومت کے خلاف پرامن مظاہرہ کرتے اور جماعت اسلامی کے کارکنان یا وکلا کی طرح سر پھٹواتے تو خارج میں نتائج بہت مختلف ہوتے۔ ہمارے خیال میں پاکستان میں اسلام وعدل کا نفاذ پرامن جدوجہد اور قربانیاں دینے سے ہوگا اور پاکستان میں نفاذِ اسلام کے بعد ملتِ کفر سے جہاد وقتال کا مرحلہ آئے گا اور ساری دنیا میں اسلام کا غلبہ ریاستی سطح پر ہونے والے جہاد وقتال سے ہوگا۔

ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ انڈیا ہو، امریکہ، اسرائیل ہو یا برطانیہ، ان ظالم اقوام کے ظلم کے خلاف جہاد وقتال اسی صورت میں کامیاب ہوسکتا ہے جبکہ پاکستان میں پہلے اسلامی نظام کا

نفاذ ہو جائے اور پھر ریاست کی سطح پر ان عالمی دہشت گردوں کے خلاف قتال کیا جائے۔ پس پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ صحیح منہج پر قائم ہونے والی جہاد وقتال کی عالمی تحریک کا پہلا زینہ ہے اور ہمارے خیال میں اس پہلے زینے تک پہنچنے کے لیے کامیاب طریقہ کار وہی ہوگا جو کہ عدم تشدد پر مبنی ہو۔

علماے دیوبند کی تبلیغی جماعت، مولانا مودودی کی جماعتِ اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی اور مولانا صوفی محمد کی تحریکِ نفاذ شریعت محمدی اس وقت تک اسی منہج پر مختلف مراحل اور مدارج میں کام کر رہی ہیں اور پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے پرامن جدوجہد کے ذریعے راہ ہموار کر رہی ہیں۔ علما کو چاہیے کہ وہ ان تحریکوں کے تعاون سے نفاذِ شریعت کے لیے ایک عظیم احتجاجی تحریک کی بنیاد رکھیں۔ یہی ہمارے نزدیک جہاد کا وہ حقیقی عمل ہے جس کو تیز کرنے کی اشد ضرورت ہے اور یہ اسی وقت تیز ہوسکتا ہے جبکہ علماے دیوبند، اہل الحدیث علما اور بریلوی اہل علم کی سرپرستی اس کو حاصل ہوگی۔ معروف اہل حدیث رہنما حافظ ابتسام الٰہی ظہیر نے مولانا صوفی محمد کے بیانات اور اقدامات کی تحسین کی ہے۔ ہمارے خیال میں نفاذِ شریعت کی خاطر اتحاد کی راہ ہموار کرنے کے لیے مذہبی اختلافات سے بالاتر ہوکر ایسے تائیدی بیانات دینا، اس لحاظ سے ایک قابل تحسین امر ہے کہ ہر مذہبی گروہ نفاذِ شریعت کے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔

کچھ ہی دن پہلے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی کہ کراچی کے حلقہ دیوبند کے علما نے تحریک نفاذ شریعت محمدی کے دفاع کے لیے ایک حکمتِ عملی تیار کرنے کے لیے جامعہ فاروقیہ میں علما کا ایک اجلاس طلب کیا ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ مؤرخہ ۲۷/اپریل کو جامعہ نعیمیہ لاہور میں ملی مجلس شرعی کے زیر اہتمام بھی اہل تشیع، اہل الحدیث، بریلوی اور دیوبندی علما کی ایک مجلس کا انعقاد ہوا۔ جس میں ایک مشترکہ اعلامیہ کے ذریعے سوات اور مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذِ شریعت کے حکومتی اقدام کو برقرار رکھنے اور سارے پاکستان میں نظامِ عدل کے قیام کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ علما نے اپنے اس اجلاس اس بات کو واضح کیا ہے کہ سوات میں نافذ ہونے

والے نظامِ عدل کی ایک دفعہ کے مطابق تمام فرقوں کو ان کے پرسنل لاز میں ان کے مذہب کے مطابق فیصلے حاصل کرنے کی آزادی ہوگی اور قاضیوں کا تقرر بغیر کسی مسلکی تفریق کے کیا جائے گا۔ ایسا ہی ایک اجلاس مؤرخہ ۳۰/اپریل کو جامعہ اشرفیہ میں اور ۶ مئی کو مسجد قادسیہ میں بھی منعقد ہوا جس میں اس نفاذ شریعت کے مسئلے پر علما کے مابین اتفاقِ رائے کے نتیجے میں مشترکہ لائحہ عمل تشکیل دیا گیا۔ دوسری طرف مؤرخہ ۲۸ اپریل کی خبر یہ بھی ہے کہ سیکورٹی فورسز کے صوبہ سرحد کے علاقے لوئر دیر میں آپریشن کو مولانا صوفی محمد نے معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیا ہے اور طالبان نے ایک بار پھر سوات کی گلیوں میں مسلح ہو کر گشت شروع کر دی ہے۔ دوسری طرف مرکزی حکومت نے بھی اے این پی کی رضامندی سے سوات میں ایک بڑے آپریشن کی تیاری کر لی ہے۔

ہمارے خیال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ علما اس وقت اپنی سرپرستی میں ایک پرامن تحریک کا آغاز کریں۔ عدل کے قیام، غریب کو انصاف مہیا کرنے، ساری قوم کو امریکہ کی غلامی سے نجات دلوانے، ظالم حکمرانوں کے ظلم کے خاتمے، حدود اللہ کے نفاذ، امن وامان کے قیام، عریانی وفحاشی کے سیلاب کی روک تھام، اُخروی نجات اور مسلمانانِ پاکستان کی دنیاوی فلاح و بہبود کی خاطر ایک ایسی پرامن احتجاجی تحریک برپا کرنے میں آخر کیا مانع ہے کہ جس میں علما کسی کی جان لینے کی بات نہ کرتے ہوں بلکہ ظالم و فاسق حکمرانوں سے آزادی کے طلب گار ہوں۔

پاکستان کے مذہبی حلقے کو ان ظالم حکمرانوں اور ان کے جابرانہ نظام سے آزادی کی یہ جنگ لڑنی ہوگی۔ یہ جنگ ضرور ہوگی، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں! اور یہ جنگ بغیر کسی بندوق، کلاشنکوف، اسلحے یا راکٹ لانچر کے لڑی جائے گی۔ اور ان شاء اللہ فتح ہمارا مقدر ہے۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔ آمین یاربّ العٰلمین!

ماہنامہ محدث ۲۰۰۸ء کے تمام شمارے ایک جلد میں یکجا
قیمت ۲۸۰ روپے ..... فوری رابطہ کریں!

قانون وقضا

'نظامِ عدل ریگولیشن ۲۰۰۹ء' کا متن

ملک بھر میں اس وقت 'نظام عدل ریگولیشن' کا چرچا ہے اور دنیا بھر میں بھی اسے موضوعِ بحث بنایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں ۱۵/فروری ۲۰۰۹ء کا وہ معاہدۂ امن جو اس نظامِ عدل کی اساس بنا، اور ۱۳/اپریل کو قومی اسمبلی کی قرارداد کے بعد صدر کے دستخطوں سے منظور ہونے والے نظامِ عدل ریگولیشن کے مسودے کا اُردو ترجمہ، ان دونوں کو ذیل میں شائع کیا جارہا ہے۔ نظام عدل کا انگریزی مسودہ تو خال خال دستیاب ہے، البتہ اس کا اُردو ترجمہ کافی محنت کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ اس متن میں بطورِ خاص آرٹیکل ۲ کی دفعہ ہ، ی اور وضاحت، آرٹیکل ۴، آرٹیکل ۷ کی دفعہ ۳ اور آرٹیکل ۸ و ۹ قابل توجہ ہیں جس سے اس نظام عدل کی نوعیت اور اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس مسودہ پر مزید تبصرہ وتجزیہ اگلے شماروں میں ملاحظہ فرمائیں۔ ح م

''شمال مغربی سرحدی صوبے کے وہ قبائلی علاقے جنہیں صوبائی سطح پر صوبہ سرحد کے زیر انتظام علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے، عدالتوں کے ذریعے نفاذ نظام شریعت کے تحت آئیں گے، ماسوائے ان قبائلی علاقوں کے جو مانسہرہ کے ضلع سے ملحقہ اور ہزارہ ڈویژن کی سابق ریاست 'امب' کے ذیل میں آتے ہیں۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی آرٹیکل ۲۴۷، دفعہ ۳ کی رو سے مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) یا صوبائی اسمبلی کے کسی بھی اقدام یا تحریک، کا اطلاق صوبے کے زیر انتظام قبائلی علاقوں پر، یا ان کے کسی حصے پر اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ صوبے کا گورنر، جس کی عمل داری میں مذکورہ علاقہ جات واقع ہیں، صدرِ مملکت کی منظوری کے ساتھ اس کی ہدایات، جاری نہ کردے اور ایسی ہدایات جاری کرتے وقت کسی بھی قانون کے سلسلے میں، گورنر ایسی ہدایات بھی جاری کرسکتا ہے کہ قبائلی علاقوں پر کسی قانون کا اطلاق کرتے وقت، یا اس کے کسی مخصوص حصے پر ایسا اطلاق کرتے وقت ان تمام مستثنیات اور ترامیم کو مؤثر تصور کیا جائے گا جو وقتاً فوقتاً اس سمت میں تجویز کی جائیں گی۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۲۴۷، دفعہ ۴ کی رو سے صوبے کا گورنر، صدرِ مملکت کی پیشگی منظوری کے بعد کسی بھی ایسے معاملے کی بابت، جو صوبائی اسمبلی کی قانونی عمل داری میں آتا ہو، ایسے ریگولیشنز (قواعد وضوابط) وضع کرسکتا ہے جو صوبے کے زیر انتظام قبائلی علاقوں میں امن اور گڈ گورننس کے قیام کو یقینی بنا سکے۔ چنانچہ ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے شمال مغربی سرحدی صوبے کے گورنر نے صدرِ مملکت کی منظوری کے بعد درج ذیل ریگولیشنز کا اعلان کیا ہے:

❶ مختصر عنوان، مدت اور آغاز

۱) اس ریگولیشن کو 'شریعت کے نظامِ عدل ریگولیشن ۲۰۰۹ء' کا نام دیا جائے گا۔

۲) اس کا اطلاق صوبے کے زیر انتظام آنیوالے ان تمام علاقوں پر ہوگا ماسوائے ان قبائلی علاقوں کے جو ضلع مانسہرہ سے ملحقہ اور سابق ریاست امب میں شامل ہیں، اور آگے چل کر جنہیں مذکورہ علاقوں کے نام سے پکارا جائے گا۔

۳) اس ریگولیشن پر فوری عمل درآمد کیا جائے گا۔

❷ تعریفات

۱) ان ریگولیشنز میں اسی وقت تک، جب تک، موضوع یا متن میں کسی قسم کی ناخوشگوار تبدیلی واقع نہ ہوجائے:

الف) 'عدالت' کا مطلب ہوگا، ایسی عدالت جس کا دائرۂ عمل واختیار مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہو اور جسے موجودہ ریگولیشن کے تحت قائم اور مقرر کیا گیا ہو۔ جس میں اپیل کے لئے بھی عدالت شامل ہوگی یا پھر کیس کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے نظر ثانی کی عدالت بھی شامل کی جاسکتی ہے۔

ب) 'دائر دار القضا' کا مطلب ہوگا: ایسی عدالت جہاں آخری اپیل دائر کی جاسکے یا نظر ثانی کی عدالت جو مذکورہ علاقے کی حدود کے اندر واقع ہو اور جو آئین کے آرٹیکل ۱۸۳ کی دفعہ ۲ کے عین مطابق ہو۔

ج) 'دارالقضا' کا مطلب ہوگا: اپیل یا نظر ثانی کی عدالت جسے شمال مغربی سرحدی صوبے کے

گورنر نے مذکورہ علاقے کی حدود کے اندر قائم کیا ہو، جو آئین کے آرٹیکل ۱۹۸ کی دفعہ ۴ کے عین مطابق ہو۔

د) 'گورنمنٹ' سے مراد ہوگی: شمال مغربی سرحدی صوبے کی گورنمنٹ

ہ) 'پیراگراف' کا مطلب ہوگا: اس ریگولیشن کا ایک پیراگراف ..... 'تسلیم شدہ ادارے' کا مطلب ہوگا: شریعت اکیڈمی جسے 'انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی' آرڈیننس ۱۹۸۵ء، (XXX of 1985) کے تحت قائم کیا گیا ہو یا پھر کوئی ایسا ادارہ جو علومِ شرعیہ کی تربیت دیتا ہو اور جسے حکومت منظور کر چکی ہو۔

و) 'تجویز کردہ' کا مطلب ہوگا، اس ریگولیشن کے زمرے میں آنے والے قوانین کے تحت تجویز کردہ

ز) 'قاضی' کا مطلب ہوگا، ایسا مقرر کردہ عدالتی افسر جسے شیڈول ۲ کے کالم ۳ کے عین مطابق تعینات کیا گیا ہو۔

ح) 'منظور شدہ ادارے' کا مطلب ہوگا: شریعہ اکیڈمی جسے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی آرڈیننس ۱۹۸۵ء یا کسی ایسے ادارے کے تحت قائم کیا گیا ہو جو شرعی علوم کی تربیت دیتا ہو اور حکومت سے منظور شدہ ہو۔

ط) 'شیڈول' کا مطلب ہوگا: موجودہ ریگولیشن کا کوئی شیڈول

ی) 'شریعت' سے مراد ہوگی: وہ اسلامی تعلیمات و احکامات جو قرآنِ مجید اور سنت نیز اجماع اور قیاس میں بیان کی گئی ہیں۔

وضاحت: کسی بھی مسلمان فرقے کے پرسنل لا کا اطلاق کرتے وقت، جب کبھی قرآنِ کریم اور سنت کے الفاظ استعمال ہوں گے، تو ان کا مطلب ہوگا: قرآن اور سنتِ نبوی ﷺ کی وہ تعبیر و تشریح جو مذکورہ مسلمان فرقے کے نزدیک صحیح اور درست ہے۔

۲) دیگر تمام الفاظ، جن کی تعریف موجودہ ریگولیشنز میں نہیں کی گئی، ان کا مطلب اور مفہوم وہی ہوگا جو کسی بھی ایسے قانون میں موجود ہوگا جو مذکورہ علاقے میں وقتی یا عارضی طور پر نافذ العمل ہوں گے۔

۳) بعض قوانین کا اطلاق:

i) وہ قوانین جو شیڈول نمبر ا کے کالم ۲ میں دیئے گئے ہیں اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اس ریگولیشنز کے نفاذ سے قبل نافذ العمل تھے، اور ان کے علاوہ وہ تمام قوانین، نوٹیفکیشن اور احکامات جو ریگولیشنز کے آغاز اور نفاذ سے قبل مذکورہ علاقوں میں نافذ العمل تھے۔

ii) وہ تمام قوانین جن کا اطلاق مذکورہ علاقے پر ہوگا جن میں وہ قوانین بھی شامل ہیں جو ذیلی پیراگراف نمبرا میں بیان کئے گئے ہیں اور جو ان تمام مستثنیات اور ترامیم سے مشروط ہوں گے جن کا ذکر موجودہ ریگولیشنز میں کیا گیا ہے۔

❹ بعض قوانین کالعدم ہوجائیں گے یا ان پر عمل درآمد نہیں ہوگا: اگر اس ریگولیشنز کے آغاز اور نفاذ سے فوری پیشتر، مذکورہ علاقوں میں کوئی ایسا قانون نافذ العمل تھا اور اس پر عمل درآمد ہورہا تھا، یا کوئی ایسا ذریعہ، رسوم و رواج یا کسی اور شکل میں کوئی بھی ایسا قانون موجود تھا جو قرآنِ مجید اور سنتِ نبویؐ کے احکامات، تعلیمات اور ہدایات کے عین مطابق نہ تھا تو ایسی صورت میں موجودہ ریگولیشنز کا نفاذ ہوتے ہی اس علاقے میں ایسے تمام قوانین فوری طور پر کالعدم تصور کئے جائیں گے۔

❺ عدالتیں: 'دار دارالقضا' اور 'دارالقضا' کے علاوہ مذکورہ علاقے میں درج ذیل عدالتیں بھی کام کرتی رہیں گی جنہیں بااختیار دائرۂ عمل واختیار حاصل رہے گا:

الف) ضلع قاضی کی عدالت

ب) اضافی ضلع قاضی کی عدالت

ج) اعلیٰ علاقہ قاضی کی عدالت

د) علاقہ قاضی کی عدالت

ہ) ایگزیکٹو مجسٹریٹ کی عدالتِ قضا

❻ ان کے اختیارات اور فرائض:

ا) مذکورہ علاقے میں تعینات ہونے والے علاقہ قاضی کو شمال مغربی سرحدی صوبے کے عدالتی افسر کا درجہ اور حیثیت حاصل ہوگی۔ بہرنوع اس سلسلے میں ترجیح ان عدالتی افسران کو دی

جائے گی جنہوں نے کسی تسلیم شدہ ادارے سے شریعت کے کورس کی تکمیل کی ہوگی۔

۲) فوجداری مقدمات کی کارروائی اور پیش رفت کے حوالے سے تمام تر اختیارات، فرائض اور ذمہ داریاں شمال مغربی سرحدی صوبے کے ان عدالتی افسران کو ان قوانین کے تحت تفویض کی جائیں گی جو علاقے میں وقتی طور پر نافذ العمل ہوں گے اور جن پر شیڈول نمبر۲ کے متعلقہ کالم کے تحت تسلیم شدہ اُصولِ شریعہ کے عین مطابق عمل درآمد کیا جارہا ہوگا۔

۳) دارالقضا کے عہدے کی نگرانی سے مشروط، ضلع قاضی ماتحت عدالتوں کی کارروائی کی نگرانی کرے گا اور متعلقہ ضلعی پولیس افسر کے توسط سے خدمت گار اسٹاف کی تقرری کو اپنے دائرۂ اختیار کی مقامی حدود میں رہتے ہوئے ممکن بنائے گا۔

۷ ایگزیکٹو مجسٹریٹ

۱) ہر ضلع اور محفوظ علاقے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، سب ڈویژنل مجسٹریٹس اور دیگر ایگزیکٹو مجسٹریٹس صوبے کے گورنر کی ضروریات کے عین مطابق تعینات کئے جائیں گے۔

۲) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور تمام دیگر ایگزیکٹو مجسٹریٹس اپنے فرائض، ذمہ داریوں اور اختیارات کا استعمال شریعت کے تسلیم شدہ قوانین کے علاوہ ان قوانین کے مطابق کریں گے جو وقتی طور پر اس علاقے میں نافذ العمل ہیں۔

۳) قیامِ امن، نظم ونسق، امن عامہ، حکومت کی ایگزیکٹو اتھارٹی کا نفاذ اور سدِ ذرائع جنایات ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرائض منصبی، ذمہ داریوں اور اختیارات میں شامل ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کی غرض سے وہ شریعت کے تسلیم شدہ قوانین کی رو سے کسی بھی فرد کے خلاف ایکشن لینے کا مجاز ہوگا۔

۴) وہ تمام کیسز جو اس ریگولیشنز کے شیڈول نمبر III میں شامل ہیں، اُنہیں خصوصی طور پر ایگزیکٹو مجسٹریٹس کی عدالتوں میں چلایا جاسکے گا۔

وضاحت: 'سدِ ذرائع جنایات' کا مطلب ہے: وہ تمام اقدامات اور فیصلے جو شرعی قوانین کے تحت یا کسی دیگر ایسے قانون کی روشنی میں کئے گئے ہیں جو جرائم پر قابو پانے کے لئے علاقے میں نافذ العمل ہے۔

❽ قاضی عدالت یا ایگزیکٹو مجسٹریٹ کو چالان کی پیشی

۱) پولیس اسٹیشن کے ہر ایک افسر انچارج کی ڈیوٹی ہوگی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ ہر ایک فوجداری مقدمے میں مکمل چالان متعلقہ عدالت کے روبرو، ایف آئی آر درج کرانے کی تاریخ کے، چودہ دنوں کے اندر اندر پیش کردیا جائے ماسوائے اس کیس کے، جس میں متعلقہ قاضی یا ایگزیکٹو مجسٹریٹ نے مخصوص مدت کے لئے وقت کی خصوصی توسیع کے احکامات صادر کئے ہوں۔ اگر کوئی بھی افسر انچارج جس کا تعلق پولیس اسٹیشن یا تحقیقاتی افسر سے ہو مکمل چالان مقررہ مدت کے اندر جمع کرانے میں ناکام ہو تو قاضی یا ایگزیکٹو مجسٹریٹ اس معاملے کو مجاز اتھارٹی کے حوالے کردے گا تاکہ اس تاخیر کے ذمے دار کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاسکے اور اس کے خلاف ضروری تنظیمی کارروائی کرتے ہوئے اس کی اطلاع متعلقہ قاضی یا ایگزیکٹو مجسٹریٹ کو دی جائے۔

۲) پولیس اسٹیشن کا افسر انچارج، ایف آئی آر کی ایک نقل متعلقہ قاضی یا ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے روبرو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر پیش کرتے ہوئے قاضی اور ایگزیکٹو مجسٹریٹ کو وقتاً فوقتاً کیس کی تحقیقاتی پیش رفت سے آگاہ کرتا رہے گا۔

❾ شرعی قوانین کے عین مطابق کارروائی

۱) قاضی یا ایگزیکٹو مجسٹریٹ، قرآنِ مجید، سنتِ نبویؐ، اجماع اور قیاس سے، ضروری ہدایات اور رہنمائی کی روشنی میں تمام مقدمات کی کاروائی کو چلائیں گے، جو شرعی قوانین کے طریقۂ کار کے عین مطابق ہوگی اور تمام مقدمات کے فیصلے بھی شریعت کے قوانین کی روشنی میں کئے جائیں گے۔ قرآنِ مجید اور سنتِ نبویؐ کی تعلیمات، احکامات اور ہدایات کی تعبیر و تشریح کے پیش نظر قاضی اور ایگزیکٹو مجسٹریٹ قرآنِ مجید اور سنتِ نبوی ﷺ کی تعلیمات کے مسلمہ اُصولوں کو ہر ہر قدم پر پیش نظر رکھیں گے اور اس مقصد کے حصول کی غرض سے اسلام کے تسلیم شدہ فقہا کی آرا اور خیالات کو بھی مدنظر رکھیں گے۔

۲) کوئی بھی عدالت اس وقت تک کسی مقدمے کی سماعت نہیں کرسکے گی جب تک مدعی اور مدعا علیہ متعلقہ کاغذات و دستاویزات کی بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک وصولی کی توثیق و تصدیق نہ کردیں۔'' (جاری ہے)

معاہدۂ امن کا متن

اعلان

''مولانا صوفی محمد بن الحضرت حسن اور صوبائی حکومت کے کامیاب مذاکرات کے بعد صوبائی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آج سے مالاکنڈ ڈویژن بشمول ضلع کوہستان ہزارہ کے نظام عدالت کے تعلق میں جتنے غیر شرعی قوانین یعنی قرآن وسنت کے خلاف ہیں، وہ موقوف اور کالعدم تصور ہوں گے یعنی ختم ہوں گے۔ اسی نظامِ عدالت میں شریعتِ محمدی جس کی تفصیل اسلامی فقہ کی کتابوں میں موجود ہے اور اس کے ماخذ چار دلائل ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس وجوباً نافذ العمل ہوں گے۔ اس کے خلاف کوئی فیصلہ قبول نہیں ہوگا اور اس کی نظر ثانی یعنی اپیل کی صورت میں ڈویژن کی سطح پر دار القضاء یعنی شرعی عدالت بنچ قائم کر دیا جائے گا جس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔

حضرت صوفی محمد بن الحضرت حسن کے باہمی مشورے سے عدالتی شرعی نظام کے ہر نکتے پر تفصیلی غور کرنے بعد اس کا مکمل اطلاق مالاکنڈ ڈویژن بشمول ضلع کوہستان ہزارہ میں امن قائم کرنے کے بعد باہمی مشورہ سے کیا جائے گا۔ ہماری حضرت صوفی محمد بن الحضرت حسن سے درخواست ہے کہ وہ اپنا پر امن احتجاج ختم کرنے کے بعد مالاکنڈ ڈویژن کے تمام علاقوں میں امن قائم کرنے میں حکومت کا ساتھ دیں۔''

دستخط حکومتی عہدیداران

میاں افتخار حسین (صوبائی وزیر اطلاعات)

حاجی ہدایت اللہ خاں (صوبائی وزیر لائیوسٹاک)

فیاض خان طورو (سیکرٹری محکمہ داخلہ)

محمد فاروق سرور (سیکرٹری محکمہ قانون)

طاہر علی شاہ (صوبائی وزیر صحت)

ہمایوں خاں اخوندزادہ سکندر خاں

دستخط عہدیداران تحریک نفاذ شریعت محمدی

مولانا محمد عالم (نائب امیر، ملاکنڈ ڈویژن بشمول کوہستان)

امیر عزت خاں (ترجمان، ملاکنڈ ڈویژن بشمول کوہستان)

مولانا سرور محمد (رکن شوریٰ تحریک.....)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملی مجلس شرعی

کنوینر: مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی

سوات میں نظام عدل کے نفاذ کے حوالہ سے تمام مکاتب فکر کا مشترکہ اجلاس

سوات میں نفاذ عدل کے حوالے سے 'ملی مجلس شرعی' کا اجلاس ۲۷/اپریل ۲۰۰۹ء بروز پیر بعد نماز مغرب جامعہ نعیمیہ، لاہور میں منعقد ہوا جس میں تمام مکاتب فکر اور مسالک کے نمائندہ علمائے کرام نے بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہوئے مشترکہ اعلامیہ کی منظوری دی۔

اجلاس میں مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی (جامعہ نعیمیہ)، مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی (جامعہ رحمانیہ)، مولانا مفتی محمد خان قادری (جامعہ اسلامیہ)، مولانا محمد اکرم کاشمیری (جامعہ اشرفیہ)، ڈاکٹر محمد امین، مولانا غلام رسول سیالوی، حافظ اسعد عبید، امیر العظیم، انجینئر سلیم اللہ خاں، حافظ عاکف سعید (امیر تنظیم اسلامی)، ڈاکٹر سید محمد نقوی نجفی، جناب مہدی حسن (جامعہ منتظر)، مولانا شہزاد مجددی، مولانا تقویم الحق (مرکز علوم اسلامیہ منصورہ)، شیخ الحدیث عبید اللہ عفیف، مولانا عبد الغفار روپڑی، قاری احمد میاں تھانوی، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، مولانا ثناء اللہ، قاری شیخ محمد یعقوب (جماعۃ الدعوۃ)، علامہ ارشد حسن ثاقب اور مولانا مجیب الرحمن انقلابی سمیت دیگر علماے کرام شریک ہوئے۔ اجلاس میں درج ذیل اعلامیہ پر اتفاق کیا گیا:

۱۔ سوات میں نظامِ عدل، نفاذ شریعت اور معاہدہ امن کی مکمل حمایت کرتے ہوئے قرار دیا گیا کہ شرعی عدالتوں کے لئے قاضیوں کا تقرر مسلک سے بالاتر ہو کر کیا جائے۔

۲۔ سوات اور قبائلی علاقوں سمیت پاکستان بھر میں سنجیدگی اور خلوصِ دل سے تمام شعبہ ہائے زندگی میں عملی طور پر اسلام نافذ کیا جائے۔

۳۔ نفاذِ اسلام کی حکمت عملی اور ترجیحات کا تعین کرنے کے لئے تمام مکاتب فکر کے مستند علماے کرام پر مشتمل ایک 'شریعہ بورڈ' بنایا جائے۔

۴۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے امریکی پالیسی سے فوری علیحدگی اختیار کرتے ہوئے

امریکہ و یورپ کی معاونت بند کی جائے۔ نیز امریکی ڈرون حملوں اور امریکہ، اسرائیل، بھارت اور افغانستان اپنے گٹھ جوڑ سے جو مداخلت کار قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں بھجوا رہے ہیں، اسے ملک دشمن کاروائی قرار دیتے ہوئے فوری سدباب کیا جائے۔

۵۔ قبائلی علاقوں کے عوام کو ساتھ ملایا جائے، وہاں خلوصِ دل سے معاہدے کے مطابق مکمل شریعت نافذ کی جائے اور ان کے مسائل ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں بلکہ انہیں پاکستان کا باقاعدہ حصہ قرار دیا جائے۔

۶۔ یہ اجلاس ان عناصر کی مذمت کرتا ہے جو حیلے بہانے سے حکومتِ پاکستان اور تحریک نفاذِ شریعت محمدی کے درمیان معاہدے اور مفاہمت کو سبوتاژ کرنے کی سازش کر رہے ہیں اور یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان کے جھانسے میں آئے بغیر ایسے اقدامات سے گریز کرے جس سے امن وامان تباہ اور وطن عزیز کی سلامتی خطرے میں پڑے۔ نیز ایسے بیانات اور اقدامات سے مکمل طور پر گریز کیا جائے جس سے مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر میں باہمی اختلافات و انتشار کو ہوا ملتی ہو۔ ان علاقوں میں عبادتگاہوں، مزارات، مذہبی شخصیات کو تحفظ کو یقینی بناتے ہوئے سابقہ نقصان کی تلافی کی جائے۔

۷۔ 'ملی مجلس شرعی' نظامِ عدل، بحالی امن اور نفاذِ شریعت کے لئے حکومت اور فاٹا کی اسلامی تحریکوں کے مثبت اقدامات کی تعریف وحمایت کرتی ہے، تاہم یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہاں کی اسلامی تحریکوں کو نفاذِ شریعت کی حکمتِ عملی اور ترجیحات کے تعین پر پاکستان کے جید علما سے مشاورت کرنی چاہئے۔ چنانچہ ملی مجلس نے تمام مکاتبِ فکر کے مندرجہ ذیل علماء پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی جو مولانا صوفی محمد اور طالبان رہنماؤں سے مل کر ان سے مشاورت کرے گی تاکہ قبائلی علاقوں اور پاکستان کے لئے نفاذ شریعت، قیام نظام عدل اور بحالی امن وامان کے لئے ایک متوازن اور معتدل پالیسی کے رہنما خطوط وضع کئے جاسکیں:

۱۔ مولانا حافظ فضل الرحیم ۲۔ مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی

۳۔ مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی ۴۔ مولانا عبدالمالک، منصورہ

۵۔ مولانا مفتی محمد خاں قادری ۶۔ مولانا عبدالغفار روپڑی

جس میں باہمی مشاورت سے مزید علمائے کرام کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

فقہ واجتہاد

مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد
مفتی جامعہ مدنیہ، لاہور

ویڈیو اَور سی ڈی سے سکرین پر حاصل شدہ تصویر کا حکم

چند دن پہلے اِس موضوع پر دارالعلوم کراچی کا متفقہ فتویٰ پڑھنے کو ملا پھر ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ کے 'البلاغ' میں جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے مولانا زاہد صاحب اور دسمبر ۲۰۰۸ء کے 'محدث' میں مولانا زاہد الراشدی کے شائع شدہ مضامین نظر سے گزرے۔ جون ۲۰۰۸ء کے 'محدث' میں جامعہ اشرفیہ کے مولانا یوسف خان صاحب کا مضمون اس سے قبل دیکھ چکا تھا۔ یہ سب حضرات ویڈیو اَور سی ڈی سے سکرین پر حاصل شدہ صورت کو تصویر نہیں مانتے۔ ہمیں اِن حضرات سے اتفاق نہیں ہوا اور مناسب معلوم ہوا کہ ہم واضح دلائل کے ساتھ اپنا موقف بھی پیش کردیں اور ضروری وضاحتیں بھی کردیں۔ راقم

بسم اللہ حامدًا و مصلیًا

ایک وقت تھا کہ کسی سطح پر کسی صورت کے بننے یا بنانے کے اعتبار سے دو صورتیں ہوتی تھیں:

① ناپائیدار عکس جو کسی کی صنعت کے بغیر پانی پر یا آئینہ پر خود بخود بنتا ہے اور شے کے سامنے سے ہٹ جانے پر خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔

② کاغذ یا کپڑے یا کسی اور چیز پر پائیدار نقش بنایا جائے جس کی بقا کا مدار عکس کے خلاف ذی صورت کے سامنے نہ ہونے پر نہ ہو۔

کسی جاندار کی صورت گری کی پہلی صورت یعنی کسی جاندار کو مثلاً آئینہ کے سامنے کھڑا کرنا بالاتفاق جائز ہے جبکہ دوسری صورت یعنی کاغذ یا کپڑے وغیرہ پر کسی بھی طریقے سے کسی جاندار کا پائیدار نقش بنانا برصغیر کے، ہمارے علماء کے نزدیک بالاتفاق ناجائز ہے۔

اور بنیادی طور پر یہی دو صورتیں ہیں اور ان کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں ہے لیکن جدید زمانے میں صورت گری کی مزید دو نئی صورتیں سامنے آئیں:

پہلی صورت :فلم کی نگیٹو(Negative) ریل پر بنائی ہوئی تصویروں میں سے روشنی گزار کر سامنے سکرین پر اس کا عکس ڈالا جائے۔ نگیٹو فلم پر تصویر کا ہونا تو واضح ہے لیکن اُس میں سے روشنی گزار کر سکرین پر تصویر کا عکس ڈالنا کیا حکم رکھتا ہے؟ اس کو ہم آگے بیان کرینگے۔

دوسری صورت : ڈیجیٹل(Digital) کیمرے کے ذریعہ سے پہلے ویڈیو ٹیپ یا سی ڈی تیار کی جاتی ہے جس میں کوئی تصویر نہیں ہوتی بلکہ برقی ذرات یا شعاعی اعداد و شمار ایک ترتیب سے محفوظ ہو جاتے ہیں پھر وی سی آر VCR کے ذریعہ ویڈیو ٹیپ کو چلا کر کمپیوٹر سے سی ڈی کو چلا کر مطلوبہ منظر کو سکرین پر لایا جاتا ہے۔ سکرین پر دیکھے جانے والے منظر کا نقش پائیدار نہیں ہوتا بلکہ جونہی ویڈیو اور سی ڈی کا سکرین سے رابطہ ختم کیا جاتا ہے تو سکرین خالی ہو جاتی ہے۔

غرض پہلی صورت کے برخلاف اس صورت میں اوّل تو ٹیپ یا ڈسک پر سرے سے تصویر نہیں ہوتی دوسرے اس کو چلانے پر سکرین پر صورت تو نظر آتی ہے لیکن اس کا نقش پائیدار نہیں ہوتا۔ اُوپر ہم بتا چکے ہیں کہ بنیادی طور پر دو ہی صورتیں ہیں یا تو عکس یا تصویر۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ویڈیو ٹیپ یا سی ڈی سے سکرین پر حاصل شدہ صورت یا منظر عکس کے ساتھ لاحق ہے یعنی عکس کے حکم میں ہے یا تصویر کے ساتھ لاحق اور اس کے حکم میں ہے۔ اس کو جاننا دو مقدموں پر موقوف ہے۔

مقدمہ نمبر ا: تصویر کیا ہوتی ہے؟

عکس وہ ہوتا ہے جو خود بخود آئینے میں یا پانی پر یا ٹی وی سکرین پر بنے جبکہ لائیو پروگرام ہو یا متعدد آئینوں کو ایک خاص ترتیب میں رکھ کر دُور تک عکس کو لے کر جانا ہو، ان میں عکس بننا کسی کے عمل کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ تو ہے کہ آپ کسی کے سامنے آئینہ رکھ دیں یا ٹی وی کے لائیو پروگرام کا سیٹ اَپ تیار کر دیں یا متعدد آئینوں کو ایک ترتیب سے رکھ دیں۔ یہ عمل آپ کا ہوگا لیکن عکس آنے میں آپ کا کوئی عمل نہیں ہوتا۔ جب ڈُو عکس آئینہ اور سیٹ اَپ کے سامنے ہوں گے تو عکس خود بخود بنے گا اور ڈُو عکس کے سامنے سے ہٹ جانے سے عکس ختم ہو جائے گا۔

اس کے برخلاف تصویر میں عکس کو بنایا جاتا ہے یا خود بنے ہوئے عکس کو محفوظ کیا جاتا ہے مثلاً آئینہ میں بنے ہوئے عکس کو روغن پینٹ وغیرہ لگا کر محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ کیمرہ سے لی گئی

فوٹو کے بارے میں بحث سے یہ بات ثابت ہے کہ طریقۂ کار کو اہمیت حاصل نہیں ہے، لہٰذا عکس بنانا کسی بھی طریقہ سے ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا۔

پہلے دور میں عکس بنانے کا صرف ایک طریقہ تھا یعنی یہ کہ وہ پائیدار ہو، اس لیے فقہاء نے عکس اور تصویر میں فرق اس کی پائیداری کی بنیاد پر کیا، اب ہمارے دور میں عکس بنانے کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے جس میں بنایا ہوا عکس پائیدار تو نہیں ہوتا، لیکن وہ عکس بہرحال بنایا جاتا ہے، بنائے بغیر وہ عکس نہیں بنتا۔ ڈوعکس کو ٹی وی سکرین یا کمپیوٹر سکرین کے سامنے کھڑا کردیجئے، کچھ عکس نہیں بنے گا۔ اب آپ ویڈیو کیمرہ لیجئے اور ویڈیو ٹیپ تیار کیجئے پھر اس ٹیپ کو وی سی آر پر چلایئے تو آپ کو اس سکرین پر منظر اور عکس نظر آئے گا۔ یہ عکس خود بخود نہیں بنا بلکہ آپ کے بنانے سے بنا ہے اور آپ نے اس کا سبب محفوظ کرلیا ہے اور جب چاہیں عکس کو دیکھ سکتے ہیں، لہٰذا تصویر بنانے یا عکس بنانے کی آج کے اعتبار سے دو صورتیں ہوئیں: ایک پائیدار اور دوسری ناپائیدار۔

حدیث میں جاندار کی صورت بنانے کے عمل کو مُضاھات یعنی اللہ تعالیٰ کی صورت گری کی صفت کے ساتھ مشابہت کہا گیا ہے، اصل چیز عکس بنانے کا عمل ہے۔ اس کی اس حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے:

عن أبي هريرة قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: «قال الله عزّ وجلّ ومن أظلم ممّن ذهب يخلق كخلقي.....» الخ (صحیح بخاری: ۵۵۹۷)

''حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ بتاتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو میری بنائی ہوئی (جاندار کی) صورت کی طرح صورت بنانے لگے۔''

اس حدیث میں پائیدار اور ناپائیدار کے فرق کے بغیر مشابہت کرنے کے عمل کو ذکر کیا ہے جو دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔

علاوہ ازیں تصویر بنائی جاچکی ہو تو اب مسئلہ اس کے استعمال کا رہ جاتا ہے کہ اگر احترام کی جگہ میں ہو تو ناجائز اور توہین کی جگہ پر تو ہو جائز۔ اصل مسئلہ تصویر بنانے کے عمل کا ہے اور عمل

عکس بنانے کی دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ تصویر سازی یعنی عکس بنانے کے دو طریقے ہیں: ایک پائیدار اور دوسرا غیر پائیدار اور تصویر یعنی بنائے ہوئے عکس میں پائیدار اور غیر پائیدار شامل ہیں۔

مقدمہ نمبر۲: آئینے کے عکس اور سکرین پر ویڈیو اور سی ڈی کے ذریعے حاصل شدہ صورت میں فرق:

① ویڈیو اور سی ڈی میں صنعت ہوتی ہے اور آدمی کے اختیار سے ہوتی ہے جبکہ عکس میں ایسا نہیں ہوتا۔

② سکرین پر جب چاہے صورت لانے (Produce) کرنے کے لیے ویڈیو یا سی ڈی میں اس کے اسباب کو محفوظ کرلیا جاتا ہے، آئینہ کے عکس میں ایسا نہیں ہوتا۔

③ ذی صورت کے غائب ہونے کے باوجود جب چاہو سکرین پر صورت کو ظاہر (Produce) کیا جاسکتا ہے، عکس میں ایسا نہیں ہوتا۔

④ سکرین پر جتنی طویل مدت چاہو، صورت کو برقرار رکھ سکتے ہو۔ چاہو تو دائمی طور پر رکھو جبکہ عکس میں ایسا نہیں ہوتا۔

⑤ ویڈیو اور سی ڈی میں عمل وصنعت کی وجہ سے مضاہات کا معنی پایا جاتا ہے، عکس میں ایسا نہیں ہوتا۔

⑥ ٹی وی کے لائیو (Live) پروگرام میں واضح طور پر عکس ہوتا ہے، اسکے مقابلے میں ویڈیو اور سی ڈی کے ذریعہ تحصیلِ صورت میں عمل کہیں زیادہ ہے لہٰذا وہ عکس سے قطعی مختلف ہے۔

⑦ حدیث میں ہے کہ ہم اَن پڑھ اُمت ہیں، اس لیے شریعت کے احکام کا مدار فطری طریقوں پر ہونا چاہئے۔ ویڈیو اور سی ڈی بنانے اور اُس سے صورت حاصل کرنے کے عمل کو دیکھ کر یہ حکم لگانا کہ یہ آئینہ کے عکس سے مختلف ہے، فطری طریقہ ہے، اس فطری طریقہ کو چھوڑ کر بلا وجہ سائنسی تدقیقات کی بنیاد پر اس کو آئینہ کے عکس کی طرح سمجھنا حدیث کے خلاف ہے۔

ویڈیو اَور سی ڈی سے حاصل شدہ صورت کا حکم

اُوپر کے دو مقدموں کو سمجھ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ ویڈیو اور سی ڈی سے حاصل شدہ صورت یا تو خود تصویر ہے یا تصویر کے زیادہ قریب ہے اور حکم میں اس کے ساتھ لاحق ہے۔

تنبیہ ۱: یہ بات اہم ہے کہ ویڈیو یا سی ڈی بنانا بذاتِ خود مطلوب و مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے اصل مقصود سکرین پر صورت کو ظاہر کرنا ہے۔ لہٰذا ویڈیو اور سی ڈی بنانے سے لے کر سکرین پر ظاہر کرنے تک مقصد کے اعتبار سے ایک عمل ہے۔ مقصد کو نظر انداز کر کے اس عمل کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرنا اور ہر ٹکڑے کو مستقل اور علیحدہ مقصود سمجھ کر مسئلہ کو دیکھنا درست نہیں۔ مشہور فقہی ضابطہ ہے: الأمور بمقاصدها لہٰذا ویڈیو ٹیپ اور سی ڈی بنانے کے عمل کو سکرین پر ظاہر کی جانے والی صورت سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ ذی صورت کی صورت کو اس طرح محفوظ کیا ہے کہ ذی صورت کی عدم موجودگی میں بھی جب چاہیں اس کی صورت کو حاصل کر سکیں۔ اس پہلو سے بھی ویڈیو اور سی ڈی سے حاصل شدہ صورت کاغذ کی تصویر کے زیادہ قریب ہے اور اسی کے ساتھ لاحق ہونے کے مناسب ہے۔

تنبیہ ۲: انہی مذکورہ وجوہ کی بنا پر اُوپر ہم نے جس نگیٹو فلم کی ریل کا ذکر کیا تھا کہ جس میں سے روشنی گزار کر سکرین پر تصویروں کا عکس ڈالا جاتا ہے وہ عکس بھی تصویر ہی کے حکم میں ہے۔

دو اہم وضاحتیں

پہلی وضاحت: مولانا زاہد الراشدی مدظلہ نے دسمبر ۲۰۰۸ء کے شمارہ محدث میں شائع شدہ اپنے مضمون میں حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے فتوے سے یہ بات کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے نزدیک بھی ٹی وی و سکرین پر نظر آنے والی نقل و حرکت پر تصویر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے مفتی صاحبؒ کی یہ بات تو نقل کی کہ ''تصویر کھینچنا اور کھنچوانا ناجائز ہے، خواہ دستی ہو یا عکسی دونوں تصویریں ہیں اور تصویر کا حکم رکھتی ہیں۔'' لیکن پھر اُن کے اس فتوے کو نقل کر کے کہا:

''سینما اگر اخلاق سوز اور بے حیائی کے مناظر سے خالی ہو اور اُس کے ساتھ گانا بجانا اور ناجائز اَمر نہ ہو تو فی حد ذاتہٖ مباح ہوگا۔''

مولانا زاہد الراشدی صاحب نے یہ مطلب نکالا کہ

''تصویر اور سکرین دونوں کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ارشادات کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے سوا کچھ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تصویر اور سکرین دونوں کو الگ الگ سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک سکرین پر تصویر کا اطلاق نہیں ہوتا اور اگر دیگر ممنوع امور سے خالی ہو تو سکرین حد ذاتہٖ مباح کا درجہ رکھتی ہے۔''

ہم کہتے ہیں: حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے فتوے سے مذکورہ مطلب نکالنا بہرحال درست نہیں کیونکہ اُن کے زمانے میں سینما کی فلم کی ریل نگیٹو کی صورت میں ہوتی تھی جس پر واضح طور پر تصویر کے نقش ہوتے تھے اور جاندار کی تصویر چھوٹی ہو یا بڑی اُس کو بنانا بالاتفاق ناجائز ہے۔ تو جب سینما کی سکرین پر آنے والی جاندار کی صورت اُس کی تصویر بنانے پر موقوف تھی تو مفتی صاحبؒ کی بات سے یہ مطلب کیسے نکل سکتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی سکرین پر دکھائی جانے والی نگیٹو فلم بنانے کو جائز سمجھتے ہوں گے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ احتمال ہے کہ مفتی صاحب ''نگیٹو فلم کو جائز نہ سمجھتے ہوں گے لیکن اُس کے بننے کے بعد سکرین پر حاصل شدہ صورت کو تصویر بھی نہ سمجھتے ہوں گے تو ہم جواب میں کہتے ہیں:

① مفتی صاحبؒ کے کلام میں اس احتمال پر کوئی صراحت یا دلالت نہیں ہے۔

② اس کے بارے میں ہم اوپر وضاحت کر چکے ہیں کہ وہ بھی تصویر کے حکم میں ہے۔

رہا سینما کے فی حد ذاتہٖ مباح ہونے کا معاملہ تو یہ ہمیں بھی تسلیم ہے۔ سینما و فلم جو جاندار کی تصویر اور گانے بجانے سے خالی ہو اور جس میں کوئی ناجائز امر بھی نہ ہو، وہ بلاشبہ مباح ہے۔ فلم کے ذریعہ سے جغرافیہ، تاریخ اور سائنس کے مضامین سیکھے جاسکتے ہیں۔ جاندار کو بھی بغیر سر اور چہرے کے دکھایا جاسکتا ہے۔ ٹی وی، وی سی آر اور سی ڈی کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ فی ذاتہٖ مباح ہیں جبکہ اُن کے پروگرام جاندار کی تصویر سے خالی ہوں، اسی پر مولانا زاہد الراشدی صاحب کی ذکر کردہ مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ کی یہ عبارت بھی محمول ہے:

''ان کا (یعنی ٹی وی، وی سی آر کا) حکم آلاتِ لہو ولعب اور گانے کے آلات کا نہیں ہوسکتا کہ

جس پر نیک کاموں کی بے حرمتی بنتی ہو۔ ان میں ہر مباح بھی جائز اور نیک کام بھی جائز ہے۔'' ('محدث' دسمبر ۲۰۰۸ء: ص ۴۸)

اور اسی پر مولانا ادریس کاندھلویؒ کا یہ کلام بھی محمول ہے:

''یہ (ٹی وی سکرین) چاقو ہے، اس سے خربوزہ کاٹو گے تو جائز ہے اور کسی کا پیٹ پھاڑو گے تو ناجائز ہے۔'' (ایضاً: ص ۴۸)

دوسری وضاحت: دارالعلوم کراچی کے رمضان ۱۴۲۹ھ میں جاری کئے گئے فتوے میں جاندار کی تصویر کے بارے میں فقہا کی آرا کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''اگر تصویر مجسموں کی شکل میں ہو اور اُس کے وہ تمام اعضا موجود ہوں جن پر زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ نیز وہ تصویر بہت چھوٹی بھی نہ ہو اور گڑیوں کی قسم سے بھی نہ ہو تو اس کے حرام ہونے پر پوری اُمت کا اتفاق ہے یعنی اس کا بنانا اور استعمال کرنا بالاتفاق حرام اور ناجائز ہے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

لیکن اگر تصویر مجسموں کی شکل میں نہ ہو بلکہ وہ کاغذ یا کپڑے وغیرہ پر اس طرح بنی ہوئی ہو کہ اس کا سایہ نہ پڑتا ہو تو اس کے بارے میں ائمہ کرامؒ کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جمہور فقہاء کرامؒ کا موقف اس میں بھی یہی ہے کہ یہ بھی ناجائز ہے، البتہ امام مالکؒ سے ایسی تصویر کے جائز اور ناجائز ہونے کی دونوں روایتیں منقول ہیں۔ اس لیے علماے مالکیہ کے یہاں اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

بعض مالکیہ ایسی تصویر بلا کسی کراہت کے مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں خواہ وہ موضع امتہان میں ہو یا نہ ہو۔ مالکیہ میں سے جو حضرات ان تصاویر کے جائز ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں اُن میں بہت سے بڑے بڑے محققین علماء بھی شامل ہیں۔ علامہ ابن القاسم مالکیؒ، علامہ دردیر مالکیؒ، علامہ ابی مالکیؒ..... وغیرہ جلیل القدر محققین قابل ذکر ہیں۔

حنابلہ کے یہاں بھی کپڑے یا پردے پر بنی ہوئی تصویر کے جائز اور ناجائز ہونے کی دونوں روایتیں موجود ہیں..... علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے 'المغنی' میں اور علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے 'فتح الباری' میں حنابلہ کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھا کہ اُن کے یہاں کپڑے پر بنی ہوئی تصویر حرام نہیں..... بعض سلف مثلاً حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر (جن کا شمار فقہاے مدینہ میں ہوتا ہے) سمیت بعض صحابہ و تابعین کے بارے میں یہ منقول ہے کہ وہ حضرات بھی سایہ

والی اور غیر سایہ والی تصویر میں فرق کرتے ہیں، سایہ دار تصاویر کو ناجائز اور غیر سایہ دار تصاویر کو جائز سمجھتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ دار العلوم کے فتوے کی اس عبارت سے یہ وہم ہوتا ہے کہ شاید بعض مالکیہ اور حضرت قاسم بن محمدؒ سمیت بعض صحابہ و تابعین کے رائے ہے کہ جاندار کی غیر سایہ دار تصویر بنانا بھی جائز ہے اور اس کو ہر طرح سے استعمال کرنا بھی۔

جاندار کی تصویر میں دو باتیں اہم ہوتی ہیں۔ایک اُس کو بنانا اور دوسرے اس کو استعمال کرنا۔مورتی یا مجسمہ کے بارے میں تو فتوے میں مذکور ہے کہ اس کو بنانا اور استعمال کرنا دونوں ہی ناجائز ہیں۔لیکن کاغذ اور کپڑے وغیرہ پر تصویر کے بارے میں وضاحت نہیں کہ بعض مالکیہ اور حضرت قاسم بن محمدؒ کے نزدیک جواز بنانے کا بھی ہے یا نہیں۔

یہی صورت حال مولانا تقی عثمانی کی تکملہ فتح الملهم کی عبارت کی ہے۔مولانا لکھتے ہیں:

وقد اختلف الروايات عن مالك في مسئلة التصوير ولذلك وقع الاختلاف بين العلماء المالكية في هذا والذي اجمعت عليه الروايات والأقوال في مذهب المالكية حرمة التصاوير المجسدة التي لها ظل والخلاف في ماليس له ظل مما برسم على ورق أوثوب (ج۴ص۱۵۹)

''تصویر کے مسئلہ میں امام مالکؒ سے مختلف روایتیں ملتی ہیں۔اسی وجہ سے اس بارے میں مالکی علما کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔مورتیوں کی حرمت پر تو مالکیہ کے تمام اقوال و روایات متفق ہیں، البتہ کاغذ یا کپڑے پر بنائی ہوئی تصویر میں اختلاف ہے۔''

اس طرح کی موہوم عبارتیں پڑھ کر بعض اہل علم حضرات بھی خلافِ واقعہ اس غلطی میں مبتلا ہوگئے کہ بعض مالکیہ کے نزدیک کاغذ وغیرہ پر تصویر بنانا جائز ہے۔

① جامعہ اشرفیہ لاہور کے مولانا محمد یوسف خان تکملة فتح الملهم وغیرہ سے ایک عبارت نقل کرکے اُس کا ترجمہ کرتے ہیں:

فالحاصل أن المنع من اتخاذ الصور مجمع عليه فيما بين الائمة الأربعة إذا كانت مجسدة، أما غير المجسدة منها فاتفق الأئمة الثلاثة على حرمتها أيضا والمختار عن الأئمة المالكية كراهتها لكن ذهب بعض

المالکیة إلی جوازها (تکملة فتح الملهم ۱۵۹/۴، فتح الباری: ۳۹۱/۱۰)

''خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہؒ کے نزدیک تصویر کشی بالاتفاق ناجائز ہے جبکہ وہ مجسم شے ہو۔ البتہ غیر مجسم شے کی تصویر کشی کی حرمت پر تین ائمہ فقہا تو متفق ہیں اور مالکیہ کا مختار مسلک کراہت کا ہے لیکن بعض مالکیہ کے یہاں اس کا جواز بھی پایا جاتا ہے۔''

② جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے مولانا محمد زاہد صاحب لکھتے ہیں:

''کیونکہ بیشتر فقہا کے یہاں جاندار کی تصویر کے بنانے یا رکھنے میں متعدد استثناءات موجود ہیں۔'' (مجلّہ البلاغ ص ۵۱ ذوالحجہ ۱۴۲۹ھ)

ہم کہتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ تصویر کے مسئلہ میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک تصویر بمعنی مصدر یعنی تصویر بنانا اور دوسرے اتخاذِ صورت یعنی تصویر کو رکھنا اور استعمال کرنا۔

تصویر سازی یعنی تصویر بنانا خواہ مورتی کی صورت میں ہو یا کاغذ و کپڑے پر وہ بالاتفاق حرام ہے۔ مالکیہ میں سے کسی نے یہ تصریح نہیں کی کہ اُن کے نزدیک کاغذ و کپڑے پر تصویر بنانا جائز ہے۔ اسی وجہ سے امام نوویؒ لکھتے ہیں:

قال أصحابنا وغيرهم من العلماء تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر لأنه متوعَّد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور في الأحاديث وسواء صنعه بما يُمتهن أو بغيره فصنعته حرام بكل حال لأن فيه مضاهاة لخلق الله تعالىٰ وسواء ما كان في ثوب أو بساط أو درهم أو دينار أو فلس أو إناء أو حائط أو غيرها (شرح مسلم: ۸۱/۱۴)

''ہمارے اصحاب (یعنی علمائے شافعیہ) اور دیگر علماء فرماتے ہیں کہ جاندار کی تصویر بنانا شدید حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس پر احادیث میں سخت وعید آئی ہے خواہ اس کو ایسی چیز پر بنایا ہو جس کی اہانت کی جاتی ہو یا کسی دوسری چیز پر۔ غرض تصویر بنانا ہر حال میں حرام ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے ساتھ مشابہت ہے۔ اور خواہ تصویر سازی کپڑے پر ہو یا چادر پر ہو یا درہم، دینار یا پیسے پر ہو یا برتن یا دیوار وغیرہ پر ہو۔''

البتہ تصویر رکھنے اور استعمال کرنے کے بارے میں کچھ اختلاف ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

أما اتخاذ المصور فيه صورة حيوان فإن كان معلقًا على حائط أو ثوبا

ملبوسًا أو عمامة ونحو ذلك مما لا يعد ممتهنا فهو حرام وإن كان في بساط يداس ومخدة ووسادة ونحوها مما يمتهن فليس بحرام

''رہا کسی مصور چیز کو رکھنا یا استعمال کرنا جس میں کسی جاندار کی صورت ہو تو اگر وہ دیوار پر لٹکی ہوئی ہو یا پہننے والا کپڑا ہو یا عمامہ ہو اور انہی کی طرح کا کوئی ایسا استعمال جو اہانت کا شمار نہ ہوتا ہو تو وہ حرام ہے اور اگر جاندار کی صورت ایسے فرش پر ہو جو پاؤں تلے روندا جاتا ہو یا بیٹھنے کی گدی پر ہو اور اس طرح کا کوئی ایسا استعمال جو اہانت کا شمار ہوتا ہو تو وہ حرام نہیں ہے۔''

اتخاذِ صورت یعنی تصویر کے رکھنے اور استعمال کرنے کے بارے میں وہبہ زُحیلی لکھتے ہیں:

ونقل ابن حجر في فتح الباري شرح البخاري عن ابن العربي رأيه في اتخاذ الصور قائلا: حاصل ما في اتخاذ الصور أنها إن كانت ذات أجسام حرم بالاجماع وإن كانت رقمًا فأربعة أقوال:

الاوّل: يجوز مطلقًا عملا بحديث «إلا رقمًا في ثوب»

الثاني: المنع مطلقا

الثالث: إن كانت الصورة باقية الهيئة قائمة الشكل حرم وإن كانت مقطوعة الرأس أو تفرقت الأجزاء جاز

الرابع: إن كانت مما يمتهن جاز وإلا لم يجز

''علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں تصویر کے استعمال کے بارے میں ابن العربی سے نقل کیا ہے کہ تصویر کے استعمال کے بارے میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر وہ مورتی اور مجسمہ ہے تو بالاتفاق حرام ہے اور اگر کسی چیز پر نقش ہو تو چار اقوال ہیں:

① ہر حال میں جائز ہے۔ اس کی دلیل حدیث کے الفاظ «إلا رقمًا في ثوب» ہے۔

② ہر حال میں ناجائز ہے۔

③ اگر تصویر کی اپنی مکمل شکل قائم ہے تو حرام ہے اور اگر اس کا سر کٹا ہوا ہو یا اجزا متفرق ہوں تو جائز ہے۔

④ اگر استعمال اہانت کا ہے تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔

امام نوویؒ نے بعض سلف کے بارے میں فرمایا:

وذهب بعض السلف إلى أن الممنوع ما كان له ظل وأما ما لا ظل له

فلاباس باتخاذہٖ مطلقا

''بعض سلف کا قول ہے کہ سایہ دار تصویریں (یعنی مورتیاں) منع ہیں اور رَہیں غیر سایہ دار تصویریں تو اُن کو رکھنا اور استعمال کرنا ہر طرح سے جائز ہے۔''

اوپر جن بعض مالکیہ کا ذکر ہے، اُن میں سے علامہ دردیرؒ لکھتے ہیں:

والحاصل أن تصاوير الحيوان تحرم إجماعا إن كانت كاملة لها ظل مما يطول استمراره بخلاف ناقص عضو لايعيش به لو كان حيوانا وبخلاف ما لا ظل له كنقش في ورق أو جدار أو في ما لايطول استمراره خلاف والصحيح حرمته (تكملة فتح الملهم:۱۵۹/۴)

''حاصل یہ ہے کہ جانداروں کی تصویروں کا استعمال بالاتفاق حرام ہے اگر وہ مکمل ہوں اور سایہ دار ہوں اور ایک عرصہ تک رہتی ہوں برخلاف اُس تصویر کے جس میں ایسا عضو کم ہو جس کے بغیر جاندار زندہ نہیں رہ سکتا اور برخلاف غیر سایہ دار تصویر کے جیسے کاغذ یا دیور پر نقش ہو۔ اگر ایسی چیز پر نقش ہو جو زیادہ دیر نہیں رہتی مثلاً خربوزے کے چھلکے پر تو اس میں اختلاف ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ بھی حرام ہے۔''

اس عبارت میں تصاویر کی حرمت اور عدمِ حرمت سے مراد استعمال کی حرمت وغیرہ ہے کیونکہ یہاں کاغذ یا دیوار پر نقش کے جائز ہونے کا حکم لگایا ہے۔ حالانکہ امام نوویؒ کی بات اُوپر گزر چکی ہے کہ ان پر بھی تصویر بنانا بالاتفاق حرام ہے۔ لہٰذا یہاں مراد استعمال ہے نہ کہ تصویرسازی۔ اسی طرح حضرت قاسم بن محمدؒ کے بارے میں جو روایت ہے، اس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے:

عن ابن عون قال دخلت على القاسم وهو بأعلى مكة في بيته فرأيت في بيته حجلة فيها تصاوير الندس والعنقاء

''ابن عون کہتے ہیں کہ میں بالائی مکہ میں حضرت قاسم بن محمدؒ کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے اُن کے کمرے میں ایک پردہ دیکھا جس پر پرندوں کی تصویریں تھیں۔''

اس روایت میں بھی جاندار کی تصویر کے استعمال کا ذکر ہے، بنانے کا کچھ ذکر نہیں ہے۔

.....*.....*.....

تحقیق وتنقید

زاہد صدیق مغل

جدید اعتزال کے فکری ابہامات کا جائزہ

اسلام اور تصورات عدل، فطرت، انسانیت اور خیر

① اسلام عدل اور متوازن عمل کا مذہب ہے یا توازن اور عدل کا حصول شریعت کا اہم مقصد ہے۔

② شریعت ہر طریقے میں انصاف اور عدل کے راستے کا انتخاب کرتی ہے۔

③ فلاں بات یا کام شریعت کی غلط تعبیر ہے، کیونکہ یہ عدل کے خلاف ہے۔

④ اسلام دین فطرت ہے یا دین کی ہر بات فطرت انسانی کے مطابق ہوتی ہے۔

⑤ فلاں بات یا کام شریعت نہیں ہوسکتی، کیونکہ یہ فطرت انسانی کے خلاف ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔

⑥ دنیا کا ہر مذہب انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔

⑦ ہمیں انسانیت کے پیمانے پر سوچنے کی ضرورت ہے۔

⑧ سب کے نظریات وخیالات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے کیونکہ سب لوگ انسان ہیں۔

⑨ فلاں کام یا قدر مذہب تو کجا انسانیت کا بھی تقاضا ہے یا فلاں کام تو انسانیت سے بھی گرا ہوا ہے۔ وغیرہ

مندرجہ بالا اور اسی طرح کے بے شمار بیانات ہر ذی علم شخص کو پڑھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ ان بیانات کی درست تعبیر اور وضاحت کلامی اعتبار سے اس لئے اہمیت کی حامل ہے کہ ان کے غلط معنی کی آڑ میں دلائلِ فاسدہ کا ایک طومار کھڑا کر کے احکاماتِ شریعت کی قطع و برید کا گھناؤنا کھیل کھیلا جارہا ہے۔ زیر نظر مضمون کا مقصد چند ایسے اہم فکری ابہامات کا جائزہ پیش کرنا ہے جن کی وجہ سے دورِ جدید کے مفکرین فکری کج رویوں کا شکار ہوگئے اور جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اسلام کی اصل پوزیشن سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے بلکہ یہ غلبہ اسلام کی غلط حکمتِ عملی وضع کرنے کا سبب بن رہی ہیں۔ اب ہم بالترتیب ان تصورات پر گفتگو کرتے ہیں:

❶ اسلام اور عدل☆

یاد رکھنا چاہئے کہ بیانات نمبر ۱ تا ۳ کی دو ممکنہ تعبیرات کی جاسکتی ہیں:

اوّلاً: تصورِ عدل گویا احکاماتِ شریعہ اَخذ کرنے اور جانچنے کا آزاد اور مستقل اُصول ہے، اس کے لئے انبیا کی رہنمائی اور وحی کی ضرورت اضافی ہے جیسا کہ معتزلہ اور شیعہ نے سمجھا۔

ثانیاً: شریعت عدل اور توازن کا راستہ ان معنی میں ہے کہ شریعت بذاتِ خود عدل کی تعریف بیان کرتی ہے، جیسا کہ اہل سنت والجماعت نے سمجھا۔

اُصولی اور عقلی اعتبار سے ان جملوں کی صرف دوسری تعبیر ہی درست تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام 'عدل' کا مذہب ہے مگر اصل جاننے کی بات یہ ہے کہ 'عدل کیا ہے؟' عدل کی سادہ تعریف یہی ہے کہ 'حقدار کا حق ادا کرنا' یعنی 'جس شے کا جو حق ہے وہ اسے دینا' عدل کہلاتا ہے۔ اس تعریف کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

''کسی شے کا حق کیا ہے اور یہ کیسے معلوم ہوگا؟''

چنانچہ عدل کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا موقف یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے دین کو توازن اور اعتدال کا راستہ قرار دیتا ہے تو وہ اپنے تمام علم کی بنیاد پر یہ کہتا ہے کہ وہ اس طریقے کا خالق ہے جس کے ذریعے ہم متوازن و غیر متوازن عمل کے درمیان فرق کرسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریقے کی وضاحت انبیاے کرام کے ذریعے فرمادی ہے جس پر عمل پیرا ہوکر ہی انسان اپنی زندگی کو عدل کے تقاضوں کے مطابق گزار سکتا ہے۔ یہ طریقہ اپنی اصل شکل میں قرآن، احادیثِ نبوی ﷺ اور اجماعِ اُمت کی صورت میں محفوظ ہے۔ اسی طریقے (شریعت) کو اللہ تعالیٰ نے نیکی و بدی، عدل و ظلم، اعتدال اور انتہا کے درمیان فرق قرار دیا ہے۔[1] انسانی کوششوں، حسیات، عقل اور وجدان کی مدد سے اس طریقے کو پالینا ناممکن ہے۔

درج بالا بیان نہایت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اِدراکِ حقیقت کے لئے انسانی حسیات،

☆ مضمون کا یہ حصہ جناب علی محمد رضوی کے مضمون 'اسلام میں اعتدال پسندی کے فکری ابہام پر ایک نظر' (ماہنامہ ساحل کراچی، شمارہ ستمبر ۲۰۰۵ء) سے ماخوذ ہے۔

[1] سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۸۵ کی طرف اشارہ ہے جس میں قرآن کو 'الفرقان' کہا گیا۔

عقل اور وجدان کا انکار کرنے کے بعد ہی کوئی شخص الہامی رہنمائی کی ضرورت کا قائل ہوسکتا ہے۔ ارسطو اور افلاطون جیسے یونانی فلاسفہ کا یقین تھا کہ وہ عقل کے ذریعے عدل اور ظلم کے درمیان فرق تلاش کرسکتے ہیں۔ ارسطو کا خیال تھا کہ صحیح عمل دو انتہاؤں کے درمیان حدِ اَوسط کا نام ہے مگر وہ 'حدِ اوسط' کیا ہے، ارسطو اس بارے میں کوئی واضح تمیز قائم کرسکنے سے قاصر رہا۔

جن عیسائی اور مسلم مفکرین نے ارسطو وغیرہ کے فلسفے پر اعتماد کیا، اُنہیں پیغمبروں کی ضرورت تسلیم کرنے میں مشکل محسوس ہوئی اور بالآخر وہ اس سمجھوتے پر اُتر آئے کہ پیغمبروں اور فلاسفہ دونوں کی تعلیمات کا مقصد صحیح اور غلط کے درمیان فرق واضح کرنا ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انبیا کا طریقہ سادہ و آسان ہے اور وہ عام لوگوں کے لئے ہے جبکہ فلاسفہ کا طریقہ مشکل اور سمجھنے میں دشوار گزار ہے لہٰذا وہ خواص کے لئے ہے۔ گویا ان کے اس تصور کا یہ نتیجہ نکلا کہ فلاسفہ کا طریقہ ایک اعتبار سے انبیا سے اعلیٰ ہے۔

مسلم دنیا میں فارابی و ابن سینا نے اور عیسائی دنیا میں اگسٹائین و ایکوناس نے یونانی فلاسفہ کی تعلیمات کو اسلام و عیسائیت سے مربوط کرنے کی کوششیں کیں۔ مگر امام غزالیؒ نے اس قسم کی مفاہمانہ کوششوں کو کلی طور پر مسترد کردیا اور اُنہوں نے اس قسم کے دعووں کی ناموزونیت کو واضح کردیا۔ امام صاحبؒ اہل سنت والجماعت کی ترجمانی میں فرماتے ہیں کہ صحیح و غلط، عدل و ظلم، اِعتدال و انتہا کے درمیان فرق جاننے کے صحیح طریقے کو جاننے سے عقل مکمل طور پر قاصر ہے۔ ان فلاسفہ کے بے تکے دعووں کو قبول کرنے کا مطلب دراصل تعلیماتِ انبیا کی تردید ہے جو کہ انسان کی بنیادی ضرورت 'رہنمائی' سے انکار ہے۔

معلوم ہوا کہ شریعتِ اسلامی ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم نیکی و بدی، صحیح و غلط، عدل اور ظلم کے درمیان تمیز قائم کرسکتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایسی کوئی غیر اَقداری قدر (عقل یا فطرت وغیرہ) نہیں جس کے ذریعے اسلام کو جانچا جاسکے کہ اسلام عدل ہے یا نہیں؟ اِنتہا ہے یا اعتدال، کیونکہ اسلام ہی عدل و ظلم قائم کرنے کا پیمانہ و معیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت نے شیعہ اور معتزلہ کے برعکس عدل کو اسلام کے بنیادی ستونوں میں شامل نہیں کیا، کیونکہ عدل کو شریعت کے علاوہ کسی دوسری (غیر جانبدارانہ) اصطلاح میں

بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا یہ سوال کہ 'عدل کیا ہے؟' اس کا واحد جواب ہے: 'شریعت'، اور عدل کو احکاماتِ شریعت اخذ کرنے اور اُنہیں جانچنے کے مستقل اور آزاد اُصول کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔

سادہ سی بات ہے کہ جب ہر معاملے میں خود شریعت عدل وظلم کی تعریف بیان کرتی ہے تو احکام اَخذ کرنے کے لئے عدل کس طرح بطورِ اُصول تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ یعنی جب شریعت خود اس بات کی وضاحت کرے گی کہ کیا چیز معتدل ہے اور کیا غیر معتدل، تو توازن، اعتدال اور انصاف کے تصورات کو کسی عمل کی اجازت دینے یا نہ دینے کے لئے آزاد اُصول کے طور پر قبول کرنا ناقابل فہم ہو جاتا ہے۔ اگر انصاف کا مطلب اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق عمل کرنا ہے اور توازن کا مطلب اس طریقے کا انتخاب ہے جو کتاب وسنت میں بیان ہوا، تو انصاف وتوازن کو اَخذِ احکامات کے لئے ایک اُصول کے طور پر سمجھنا کس طرح ممکن ہے؟

یاد رہنا چاہئے کہ اسلام ہی عدل وتوازن کا نام ہے اور کفر اپنی تمام تر تشریحات میں ظلم و عدمِ اعتدال ہے۔ ظلم کا مطلب اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹنا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا: ﴿مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ ''جو لوگ اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتے جو ہم نے نازل کیا تو وہی تو ظالم ہیں۔'' (المائدۃ:۴۳)

قرآنِ کریم میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ (النساء:۵۸)

''جب تم لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ ہی فیصلہ کرو۔''

شریعتِ اسلامیہ کے تصورِ عدل کی حتمی وضاحت نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے جسے حضرت علیؓ نے جامع ترمذی میں روایت کیا ہے:

«كتاب الله فيه نبأ ماكان قبلكم وخبر ما بعدكم وحكم ما بينكم هو الفصل ليس بالهزل. من قال به صَدَق ومن عمل به أُجر ومن حَكَم به عدل»

''یہ اللہ کی کتاب (قرآنِ مجید) ہے جس میں گذشتہ قوموں کے حالات ہیں اور آنے والے واقعات کی خبر ہے۔ یہ کتاب تمہارے مابین پیش آنے والے مسائل کے لئے فیصلہ کن (حَکَم) ہے۔ یہ فیصلہ کرنے والی کتاب ہے، کوئی مذاق نہیں۔ جس نے اس کی بنا پر کوئی بات کی تو اس

نے سچ بولا۔ جس نے اس کی بنا پر عمل کیا تو وہ اجر کا مستحق ہوگیا، اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا تو اُسی نے عدل کو ملحوظ رکھا۔'' (سنن ترمذی:۲۹۰۶)

چنانچہ ہر وہ تصورِ عدل جس کا منبع شریعت کے علاوہ کچھ اور ہو، درحقیقت ظلم ہے۔ ہر وہ جدوجہد جو شریعت کے علاوہ کسی دیگر تصور عدل کو نافذ کرنے کے لئے برپا کی جائے[۴] درحقیقت سرکشی ہے۔ یہی بات ابوالحسن اشعری نے صدیوں پہلے یوں ارشاد فرمادی تھی کہ

''حسن و قبح، عدل و ظلم افعال کے ذاتی وصف نہیں بلکہ شرعی وصف ہیں، عقل میں صلاحیت نہیں کہ وہ ان کا اِدراک کر سکے۔''

❷ اسلام اور فطرت

اسلامی تاریخ کے قرونِ اُولیٰ میں جو کلامی و فکری گمراہی معتزلہ کی شکل میں ظاہر ہوئی، مسلم دنیا میں اس کی نشاۃِ ثانیہ برطانوی استعمار کے بعد متجددین کی صورت میں ہوئی جنہیں ہم جدید معتزلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ گو کہ دونوں گروہوں کے طریقۂ واردات میں حیرت انگیز طور پر یکسانیت ہے البتہ دونوں کے مباحث میں قدرے فرق ہے اور ایسا ہونا ضروری ہے، کیونکہ مغربی استعمار نے جو فکری مسائل پیدا کئے ہیں، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان مسائل سے مختلف ہیں جو یونانی فکر کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ جدید معتزلہ کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ وہ خود شریعت کو معیار بنانے کے بجائے دیگر اقدار اور تصورات کو اَحکامات اخذ کرنے کے لئے بطورِ معیار قبول کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ان تصورات میں سے ایک اہم اُصول 'فطرتِ انسانی' اور اس کے تقاضے ہیں۔ (ایک اور اہم اصول 'حالات اور وقت کے تقاضے' بھی ہیں مگر یہاں ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں)۔

مذہب سے ماورا تصورِ عدل کی طرح اوپر دیے گئے بیانات نمبر۴ اور ۵ بھی فکری کج روی کا باعث بنتے ہیں، کیونکہ ان کے دو معنی ممکن ہیں:

اوّلاً: انسانی فطرت علیحدہ سے کوئی معلوم شے ہے اور اسلام اس کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے فطرت احکامات اَخذ کرنے کا ایک علیحدہ مستقل اُصول ٹھہرتا ہے۔

---

④ جیسے پاکستان میں عدلیہ کی بحالی کی حالیہ تحریک جس کا مقصد ہیومن رائٹس پر مبنی سیکولر تصورِ عدل کے حامی قانون کی بالادستی قائم کرنا ہے۔

بدقسمتی سے عام طور پر اس جملے کے یہی معنی سمجھ لئے گئے ہیں۔

ثانیاً: جب شارع یہ کہتا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ انسانی فطرت کا خالق ہے بلکہ اس طریقے کا بھی خالق ہے جس کی روشنی میں انسان اپنی فطرت کو سمجھ سکتا ہے اور اس طریقے پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی فطرت کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

ان جملوں کے پہلے معنی نہایت خطرناک ہیں، کیونکہ اس معنی کے تحت ہم اسلام کو انسانی فطرت پر کسنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے لئے انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے: (Islam must correspond to human nature) اس معنی کے مطابق اسلام کا انسانی فطرت کے تابع ہونا لازم ٹھہرتا ہے اور یہ واضح گمراہی ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہوئے کہ حق و باطل کا معیار وحی کے علاوہ کچھ اور (مثلاً نفس انسانی اور دیگر ذرائع علم وغیرہ) ہے۔ فطرت کو مستقل اور ماورائے مذہب اُصول کے طور پر قبول کرنے میں اصل مشکل یہ سوال ہے کہ وہ مستقل انسانی فطرت جس پر ہم وحی کو جانچنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کا مافیہ رمشمول (content) کیا ہے اور اس کا علم ہمیں اسلام کے علاوہ کس ذریعہ علم سے ہوا؟ اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ہمیں کسی دوسرے ذریعۂ علم سے فطرت کا علم حاصل ہو گیا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اس دوسرے ذریعہ علم کو وحی پر فوقیت دیتے ہیں، اور اس صورت میں ہمیں یہ ماننا ہوگا حق و باطل کی پہچان کے لئے اسلام کے بجائے ان دیگر ذرائع پر انحصار کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اپنے فکری اَجداد کی روش برقرار رکھتے ہوئے جدید معتزلہ اس مشکل مقام پر یہ عجیب وغریب سمجھوتہ کرتے ہیں کہ شریعت کی ضرورت ان (گنے چنے) معاملات میں پڑتی ہے جہاں انسانی فطرت وعقل کے پاس فیصلہ کرنے کی کوئی بنیاد موجود نہ ہو، دیگر تمام معاملات میں فطرت وغیرہ ہی سے ہدایت حاصل کی جائے گی۔ ظاہری بات ہے کہ یہ سمجھوتہ خلطِ مبحث کے سوا اور کچھ نہیں، کیونکہ سوال پھر وہی پیدا ہوگا کہ جن معاملات میں آپ شریعت کو خاموش فرض کرتے ہیں، وہاں فطرت کو جاننے کا ذریعہ کیا چیز ہے؟ جدید فلسفے میں علم اخلاقیات کے مباحث ومسائل کے ہر طالب علم پر یہ بات خوب واضح ہے کہ انسانی کلیات

کے ذریعے انسانی فطرت کے بارے میں جاننا ناممکن ہے، یعنی انسانی ذرائع علم میں ایسا کوئی حتمی طریقہ موجود ہی نہیں جس کے ذریعے ہم نفسِ انسانی کا مطالعہ کرکے اس سوال کا جواب دے سکیں کہ ''انسانی فطرت کیا ہے؟''

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کی اُصولی کتابوں میں فطرت بطورِ ماخذِ شریعت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان کے نزدیک ان جملوں کا درست مفہوم صرف وہی ہے جو دوسرے معنی میں ادا کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت وہی ہے جو اسلام کہتا ہے، یعنی اسلام ہی انسانی فطرت ہے اور اسلام جس شے کا حکم دیتا ہے، وہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ ③

مثلاً اگر اسلام کہتا ہے کہ داڑھی رکھو تو یہی فطرت ہے، اس لئے کہ ہمارے پاس انسانی فطرت کی پہچان کا کوئی مستند ذریعہ نہیں ہے۔ فطرت اسلام سے علیحدہ کوئی ایسی شے نہیں کہ جسے ماورائے مذہب سمجھا جاسکتا ہو اور جس کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ فلاں کام جائز ہے یا ناجائز جیسا کہ دورِ جدید کے چند معتزلہ نے 'مباحاتِ فطرت' اور 'دین فطرت' کے اُصولِ موضوعہ کی روشنی میں شریعت کی از سرنو تعبیر کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔ ④

جب اسلام خود فطرت کی تعریف بیان کرتا ہے تو پھر فطرت کو اَحکام اخذ کرنے کے لئے شریعت سے ممیز اور ماقبل ایک آزاد اُصول کے طور پر قبول کرنا کس طرح قابل فہم ہوسکتا ہے؟ اسلام کے علاوہ اس کائنات میں انسانی فطرت جاننے کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہی نہیں۔ چنانچہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ فطرتِ انسانی کیا ہے تو اس کا جواب ہے: 'اسلام'۔ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ انسانی مقاصد سے علی الرغم انسانی رویوں کے کوئی فطری قوانین (natural laws) نہیں ہوتے جیسا کہ سوشل سائنسز یہ جھوٹا دعویٰ کرتی ہیں۔ ⑤

---

③ مشہور حدیث مبارکہ «کل مولود یولد علی الفطرة» یعنی ''ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔'' کا معنی یہی ہے کہ وہ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔

④ 'فطرت بطورِ ماخذ شریعت' جاوید غامدی صاحب کے گروہ کا ایک اہم اُصول ہے جس کی آڑ میں وہ موسیقی وغیرہ کا جواز بیان کرتے ہیں۔

⑤ سوشل سائنسز درحقیقت کسی مجرد انسان نہیں بلکہ ہیومن (وہ انسان جو خود کو قائم بالذات سمجھتا ہے) کے رویے سے بحث کرتی ہیں۔

اس کائنات میں دو ہی طرح کے قوانین ہیں، وہ جو خدا نے بنائے اور وہ جو انسان خود وضع کرتا ہے۔ جس طرح مادی کائنات سے متعلق فطری قوانین خدا نے بنائے، اسی طرح انسانی رویے کے فطری اظہار اور اس کی پہچان سے متعلق قوانین بھی خدا نے بنائے جو شریعت کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ قوانین ایسے نہیں جنہیں تجربیت یا عقلیت کی روشنی میں اخذ کیا جاسکے۔ اس امکان کو ماننا درحقیقت ضرورتِ نبوت کا انکار کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے علاوہ انسانی زندگی مرتب کرنے کا جو بھی قانون انسان وضع کرتا ہے، وہ سرکشی و بغاوت ہے نہ کہ اس کی فطرت کا تقاضا۔ پس فطرتِ سلیمہ وہی ہے جو اسلامی احکامات اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ جو شخص اسلامی احکامات کو اپنی فطرت اور مزاج کے خلاف محسوس کرتا ہے، درحقیقت فطرتِ غیر سلیمہ کا مالک ہے اور ایسی ہی غیر سلیم فطرت کے تزکیہ کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے تابع بنایا جائے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہوا کہ

«لا یؤمن أحدکم حتی یکون هواه تبعًا لما جئت به»

(السنۃ لابن ابی عاصم:۱۴)

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشاتِ نفس اس چیز کے تابع نہ ہوجائیں جو میں لے کر آیا ہوں (یعنی قرآن اور سنت)۔''

قرآن وحدیث میں کسی مقام پر بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ ''لوگو! ہدایت کے لئے اپنی فطرت کی طرف رجوع کرو'' یا ''پیروی کرو اپنی فطرت کی۔'' وغیرہ اور نہ ہی یہ فرمایا کہ ''اگر کسی تک نبی یا رسول کے ذریعے میرا مطالبہ نہ پہنچا تو میں اس شخص سے حواس کی بنیاد پر مؤاخذہ کروں گا۔'' ⑥

⑥ بعض جدید مفکرین نے آیت کریمہ ﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ ''یقیناً روزِ محشر آنکھ، کان اور قلب کا حساب ہونا ہے۔'' (بنی اسرائیل:۳۶) کو بنیاد بنا کر یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنکھ، کان اور قلب ایسے انسانی ذرائع علم ہیں جن کی بنیاد پر انسان تعلیماتِ انبیا کے بغیر بھی محض حواس کی بنا پر ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ آیت کریمہ کا یہ معنی ہرگز نہیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ روزِ محشر انسان سے یہ پوچھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں آنکھ، کان وقلب کی صورت میں اسے عطا کی تھیں، وہ اس نے کہاں صرف کیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد ہوا کہ آنکھ، کان اور قلب سب کے زنا سے بچو۔

اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی درج ذیل واضح آیت فطرتِ انسانی کا تعین کرتی ہے:

﴿ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الروم:۳۰)

''یہ 'فطرت' اللہ کی تخلیق ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا فرمایا۔ اللہ کی تخلیق کو تبدیل کرنے والا کوئی نہیں۔ اور وہ (فطرت) دین قیم ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

اسی طرح ایک حدیث نبوی میں ارشاد ہے کہ ہر نومولود فطرت پر پیدا ہوتا ہے، جس کو اس کے ماں باپ (بگاڑ کر) یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری:۱۳۵۸) اسی فرمانِ نبویؐ کی ایک اور روایت میں فطرتِ اسلام بھی آیا ہے۔ یوں بھی آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس نومولود کو اس کے ماں باپ مسلمان بنا دیتے ہیں بلکہ وہ پہلے ہی اللہ کی تخلیق کے مطابق اپنی فطرتِ حقیقی یعنی اسلام پر ہوتا ہے۔ الغرض انسان کی فطرت اسلام کے مطابق ہے اور ہمارے پاس اپنی فطرت کو پہچاننے کا کوئی مستند ذریعہ شریعت الٰہیہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

❸ اسلام اور انسانیت

جدید مغربی اعتزال کی پھیلائی ہوئی فکری گمراہیوں میں سے ایک اہم انسانیت پرستی (Humanism) بھی ہے۔ اس تصور کا اظہار شروع میں دیے گئے بیانات نمبر۶ تا ۸ وغیرہ میں ہے۔ انسانیت پرستی درحقیقت اجتماعی زندگی سے مذہب کو بے دخل کرنے کا کلیدی سیکولر تصور ہے۔ اس کے مطابق انسان اَصلاً عبد نہیں بلکہ آزاد (Autonomous) اور قائم بالذات (الصَّمد Self-determined) ہستی ہے، یعنی جدید اعتزال فرد کو اصلاً عبد (انسان) کے بجائے Human سمجھتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سیکولرزم اس بات پر نہایت شدومد سے زور دیتا ہے کہ ایک عادلانہ معاشرتی تشکیل کے لئے ہمیں 'انسانیت' کی سطح پر سوچنے کی ضرورت ہے، نہ کہ کسی خاص مذہب، رنگ یا نسل وغیرہ کی بنیاد پر، یعنی معاشروں کی بنیاد ایسی قدر پر استوار ہونی چاہئے جو ہم سب میں مشترک ہے اور وہ اعلیٰ ترین اور بنیادی قدر مشترک شے اس کے نزدیک 'انسانیت' کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ مغربی اعتزال نے 'ہیومن رائٹس' کے نام پر ایک متوازی مذہب ایجاد کرکے دنیا بھر کو اس کی خودساختہ میزان پر پرکھنے کا

سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

سیکولر حضرات اپنے دعوے کی معقولیت ثابت کرنے کے لئے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''آیا پہلے اور اصلاً ہم انسان ہیں یا مسلمان؟'' عام طور پر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اصلاً تو ہم انسان ہیں اور مسلمان بعد میں، یعنی مسلمان ہونے کے لئے پہلے انسان ہونا ضروری ہے جس سے ثابت ہوا کہ ہماری اصل انسانیت ہے نہ کہ مسلمانیت۔ یہی وہ تصور ہے جس کے ذریعے سیکولرزم مذہب کو فرد کا نجی مسئلہ بنا ڈالتی ہے، کیونکہ انسانیت کو اصل قرار دینے کے بعد زیادہ معقول بات یہی دکھائی دیتی ہے کہ اجتماعی نظام کی بنیاد ایسی شے پر قائم کی جائے جو سب کی اصل اور سب میں مشترک ہو تاکہ زیادہ وسیع النظر معاشرہ وجود میں آسکے۔ نیز اگر مذہب کی بنیاد پر معاشرہ تشکیل دینے کو روا رکھا جائے گا تو پھر ہمیں رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کی بنیاد پر قائم ہونے والے معاشروں کو بھی معقول ماننا پڑے گا۔ انسان کی اصل انسانیت کو قرار دینے کے بعد مذہب کا نجی مسئلہ بن جانا ایک لازمی منطقی نتیجہ ہے اور یہی نقطہ تمام سیکولر نظامہائے زندگی (چاہے وہ لبرلزم ہو یا اشتراکیت) کی اصل بنیاد ہے۔ (سیکولرزم سے ہماری مراد ایسا نظامِ زندگی ہے جو وحی سے علی الرغم انسانی کلیات یعنی حواس و عقل وغیرہ کی مدد سے تشکیل دیا گیا ہو)۔ حیرت انگیز اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے دینی مفکرین جب سیکولر حضرات سے گفتگو فرماتے ہیں تو انسانیت کی بنیاد پر اپنے دلائل قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے یا تو اُنہیں دورانِ گفتگو پے در پے شکست ہوتی چلی جاتی ہے اور یا وہ کمزور دلائل اور تاویلات کا سہارا لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ درحقیقت انسانیت پرستی کو ردّ کئے بغیر مذہب کو اجتماعی زندگی میں شامل کرنے کی کوئی معقول علمی دلیل فراہم کرنا ممکن ہے ہی نہیں۔

یہ سوال کہ ''آیا پہلے اور اصلاً میں انسان ہوں یا مسلمان؟'' اس کا واضح اور قطعی جواب یہ ہے کہ ''میری حقیقت اور اصل مسلمان (بمعنی عبد) ہونا ہے جبکہ انسان ہونا محض ایک حادثہ اور میری مسلمانیت (عبدیت) کے اظہار کا ذریعہ ہے۔'' اس کی تفصیل یہ ہے کہ میری اصل عبد یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونا ہے، میں انسان سے پہلے ایک مخلوق ہوں جس کا کوئی خالق ہے۔ جبکہ میری انسانیت ایک حادثہ اور اتفاقی امر ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے یوں سوچیں کہ اگر میں انسان نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ ایک صورت یہ ہے کہ میں جن یا فرشتہ ہوتا، دوسری صورت یہ

ہے کہ میں حیوانات، جمادات یا نباتات کی اجناس سے تعلق رکھتا۔ مگر میں کچھ بھی ہوتا، ہر حال میں مخلوق ہوتا، یعنی اپنے وجود کی ہر ممکنہ صورت میں میری اصل مخلوق (عبد) ہونا ہی ہوتی، یہ اور بات ہے کہ میری عبدیت کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا۔ مثلاً اگر میں پودا ہوتا تو میری عبدیت کا اظہار پودا ہونے میں ہوتی، اگر میں فرشتہ ہوتا تو یہ ملکوتیت میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ بنتی اور جب میں انسان ہوں تو میری انسانیت میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ الغرض میرا حال تو تبدیل ہوسکتا ہے، لیکن میرا مقام بہر حال مخلوق (عبد) ہونا ہی رہے گا اور یہ بہر صورت ناقابل تبدیل ہے۔

میرے وجود کی ہر حالت میرے لئے ان معنوں میں اتفاقی (contingent) ہے کہ میں اپنی کسی حالت کا خود خالق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس حالت میں چاہا، مجھے میری مرضی کے بغیر تخلیق کر دیا نیز وہ اس بات پر مجبور نہ تھا کہ مجھے انسان ہی بناتا۔ پس ثابت ہوا کہ میری اصل مسلمانیت (بمعنی عبدیت) ہے اور انسان ہونا گویا میری مسلمانیت کے اظہار کا ذریعہ ہے اور اس کے علاوہ میری انسانیت اور کچھ بھی نہیں۔ ہم نے عبدیت کو مسلمانیت سے اس لئے تعبیر کیا ہے، کیونکہ اصلاً تو ہر عبد مسلمان ہی ہوتا ہے، چاہے وہ اس کا اقرار کرے یا انکار، اگر وہ اس کا اقرار زبان اور دل سے کر لیتا ہے تو مؤمن و مسلم (اپنی حقیقت اور اصل کا اقرار کرنے والا اور تابعدار) کہلاتا ہے اور اگر ماننے سے انکار کرے تو کافر (یعنی اپنی حقیقت کا انکار کرنے والا) ٹھہرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کافر کوئی نئی حقیقت تخلیق یا دریافت نہیں کرتا بلکہ اصل حقیقت (مسلمانیت یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے) کا انکار کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب میں غیر مسلم سے مخاطب ہوتا ہوں تو اُنہیں اسلام کی دعوت دے سکتا ہوں، لیکن کسی 'ماورائے اسلام انسانی مفاد' کے تناظر میں ان سے مکالمہ نہیں کرسکتا۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ میری حقیقت عبد ہونا ہے اور انسانیت محض میری عبدیت کے اظہار کا ذریعہ ہے تو یہ سمجھنا بالکل آسان ہوگیا کہ میری انسانیت کا وہی اظہار معتبر ہوگا جس میں عبدیت جھلکتی ہو نہ کہ میری خود کی مرضی اور نفس پرستی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میری عبدیت کے اظہار کا واحد معتبر ذریعہ صرف اور صرف اسلام ہے، لہٰذا میری انسانیت معتبر تب ہی ہوگی جب میری

زندگی کا ہر گوشہ اسلام کے مطابق ہو۔ اسی لئے اس نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران:۸۵)

''جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے اپنی عبدیت کا اظہار کرے گا تو اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہوگا۔''

اور ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹)

یعنی ''اظہارِ عبدیت کا واحد معتبر طریقہ اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔''

اس تفصیل کے بعد یہ سمجھنا بھی آسان ہو گیا کہ جب ہماری انسانیت محض اظہارِ عبدیت (اسلام) کا ذریعہ ہے تو اس کا اظہار زندگی کے ہر گوشے میں ہونا ضروری ہے، چاہے اس کا تعلق میری نجی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے۔

اس گفتگو سے یہ غلط فہمی بھی دور ہو جانی چاہئے کہ ''مذہب سکھانے سے پہلے بچوں کو انسان بننا سکھانا چاہئے۔'' یعنی پہلے اُنہیں یہ سکھائیں کہ انسان کیا ہے، پھر مذہب کی بات کریں۔ درحقیقت یہ فلسفہ انسانیت پرستی کی تصویب (endorsement) ہی کی ایک شکل ہے، کیونکہ ماورائے مذہب اپنے وجود کے ادراک کا مطلب یہی ہے کہ انسان اپنے ہونے کا جواز و پہچان خود اپنے اندر رکھتا ہے اور جس کا اِدراک تعلیماتِ انبیا کے بغیر بھی ممکن ہے، یعنی اصلاً ایک انسان اللہ تعالیٰ کے ماسوا ایک مستقل بالذات حقیقت، being without God ہے۔

سوال یہ ہے کہ خود کو مذہب سے علی الرغم بطور انسان پہچاننے سے کیا مراد ہے؟ یعنی میں اپنی انسانیت کو کیا پہچانتا ہوں، اظہارِ عبدیت کا ذریعہ یا اپنی اصل؟ اگر اسے اپنی اصل پہچانا تو یہی انسانیت پرستی ہے، اور اگر اظہارِ عبدیت کا ذریعہ پہچانا تو پھر مذہب سے ماورا اپنی پہچان کی بات ہی مضحکہ خیز ہے، کیونکہ اس صورت میں جو دعویٰ میں کرتا ہوں وہ یہی تو ہے کہ انسان اپنے ہونے کا جواز اور پہچان خدا سے حاصل کرتا ہے یعنی میں لامحالہ being with God ہوں، اور اپنے وجود کے اِدراک سے 'پہلے' مجھے خدا کا ادراک حاصل کرنا ہوگا۔ چنانچہ تعلیماتِ انبیا سے صرفِ نظر کر کے انسانی ذات کا جو بھی اِدراک حاصل کیا جائے گا، لازماً غلط ہوگا، کیونکہ اس کے علاوہ حقیقت کے اِدراک کا کوئی ذریعہ اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔

❹ اسلام اور خیر

اب ہم ابتدائے مضمون میں بیان کئے گئے آخری جملے کی طرف آتے ہیں۔ تصوراتِ عدل اور فطرت کی طرح 'بنیادی انسانی قدروں' کا فلسفہ بھی عمیق غلط فہمیوں کا باعث بنتا ہے۔ 'بنیادی انسانی قدروں' کے پیچھے یہ فلسفہ کارفرما ہے کہ خیر کے چند تصورات (مثلاً سچ بولنا) ایسے ہیں جو انسانیت کا تقاضا ہیں اور وہ ان معنی میں ماورائے مذہب ہیں کہ وہ اپنے جواز کے لئے مذہبی دلیل کے محتاج نہیں بلکہ وہ اپنا جواز از خود اپنے اندر (self-evident) رکھتے ہیں، کیونکہ وہ تصورات آفاقی ہیں۔ مزید یہ کہ خیر کے ان تصورات کو تمام مذاہب نے اپنی تعلیمات میں اسی لئے بطورِ خیر متعارف کروایا ہے کہ یہ آفاقی انسانی قدریں ہیں۔

انہی 'انسانی اقدار' کی آڑ میں آج کل 'بین المذاہب مکالمے' کی دعوتِ عام کی جارہی ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نقطہ نگاہ سے کسی قدر یا خیر کو ماورائے مذہب انسانی قدر کے طور پر قبول کرنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں، کیونکہ خیر کسی عمل کا 'ذاتی وصف' نہیں بلکہ ان کی بنیاد 'حکم خداوندی' ہے (نہ کہ انسانی عقل یا فطرت وغیرہ)۔ خیر وہ ہے جس کا شارع حکم دے، اور یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کو 'اپنی عقل' سے کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا محسوس ہو تو اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ نہیں کہ جس چیز کو اس کی عقل اچھا سمجھتی ہے، اسے اختیار بھی کرے اور جس کو اس کی عقل برا سمجھتی ہے، اسے ترک کردے۔ بلکہ وہ شخص صرف اسی بات کا مکلّف ہے جس کا شارع نے اس سے مطالبہ کیا ہے۔ مثلاً عام طور پر سچ بولنے کو انسانی قدر (value) سمجھا جاتا ہے، لیکن سچ بولنا بذاتِ خود کوئی قدر نہیں، کیونکہ یہ تو اس وجہ سے بھی بولا جاسکتا ہے کہ ایسا کرنا انسانی مجبوری ہے کہ وہ 'جو بھی' معاشرتی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے حصول کے لئے اسے لازماً سچ بولنا پڑے گا، بصورتِ دیگر اس مقصد کا حصول ناممکن ہوجائے گا۔

فرض کریں زید کا مقصد سرمائے میں لامحدود اضافہ ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے لازم ہے کہ زید اور اس جیسے سب لوگ سچ بولنے کو لازم سمجھیں، کیونکہ اگر سب لوگ جھوٹ بولنے لگیں تو لوگ ایک دوسرے کے معاہدات پر بھروسہ نہیں کریں گے اور سرمائے کا حصول ممکن ہی نہیں رہے گا۔ پس اگر کوئی شخص اس وجہ سے سچ بولتا ہے کہ سچ بولنا کسی معاشرتی مقصد

(مثلاً سرمائے میں اضافے) کے حصول کے لئے ضروری ہے تو سچ بولنا ہرگز بھی خیر نہیں، کیونکہ قدر کسی عمل کے تسلسل یا موافقت (consistency) کی صفت سے ہم آہنگ ہونے کا نام نہیں، بلکہ قدر تو وہ تب بنتا ہے جب اسے حکم خدا سمجھ کر کیا جائے۔ اسلام میں بھی سچ کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن یہ شرعی احکامات کے تابع ہے، چنانچہ میاں بیوی کے مابین صلح وصفائی کا راجح مقصد جب غالب آجائے تو حکم شرعی کے مطابق ہی وہاں جھوٹ کی گنجائش موجود ہے۔

اسی طرح غریب کی مدد کرنا بالذات کوئی اچھائی نہیں بلکہ اچھائی یہ تب ہوگا جب وہ حکم خداوندی سمجھ کر کیا جائے، کیونکہ غریب کی مدد اس طور پر بھی کی جاسکتی ہے کہ ایسا کرنا مجھے اچھا لگتا ہے یا اس سے میری قوم کا بھلا ہوتا ہے۔

اگر ارادہ خداوندی سے ماورا اور اوپر (transcendantal) کسی خیر وقدر (value) کے کسی تصور کا امکان مان لیا جائے تو پھر کسی مذہب کے بجائے ان 'انسانی قدروں' کی بنیاد پر معاشرتی وریاستی صف بندی کی بات بھی تسلیم کرنا ہوگی۔ چنانچہ اسلام سے باہر یا علاوہ کسی خیر اور اخلاقیات کا کوئی وجود نہیں کہ جس کی بنیاد پر میں کسی سے کلام کرسکوں۔ میں جب بھی غیر مسلم سے مخاطب ہوتا ہوں، اسے اسلام ہی کی طرف دعوت دے سکتا ہوں نہ کہ اس کے علاوہ کسی انسانی قدر یا حقوق وغیرہ کی طرف۔

جونہی میں یہ کہتا ہوں کہ مذہب (اسلام) کے علاوہ بھی کچھ آفاقی قدریں ہیں تو گویا میں اس بات کے امکان کا اقرار کرلیتا ہوں کہ خیر کا تعین کرنے کا کوئی پیمانہ ارادۂ خداوندی سے باہر بھی ہوسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ شارع کے حکم سے اوپر بھی کوئی اُصول یا حقیقت ایسی ہے جس کی پابندی خود شارع پر لازم ہے نیز اسلام ہی الدین اور الحق نہیں بلکہ کسی بڑے تصورِ خیر کا ایک حصہ ہے۔ اخلاقیات کو ہر قسم کی ایمانیات سے ماورا کوئی انسانی وصف سمجھ کر محض 'انسانی قدروں' کے طور پر قبول کرنا غلط فہمی ہے، کیونکہ اخلاقیات کوئی ٹیکنکل چیز نہیں بلکہ ایمانیات (metaphysics) ہی سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ایک عمل کسی ایک تصورِ خیر میں برا اور کسی دوسرے میں اچھا ہوسکتا ہے۔ مثلاً سود دینا اور لینا اسلام میں گناہِ کبیرہ اور جرم (corruption) ہے جبکہ سرمایہ دارانہ تصورِ خیر کا یہ لازمی جز ہے اور وقت پر سود ادا کرنا عمدہ

اخلاق کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں بیان ہوا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ﴾ (البقرۃ: ۱۷۷)

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان ایمان لائے اللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، (نازل کردہ) کتابوں پر اور انبیا پر۔''

اس تفصیلی تقاضائے ایمان کے بعد قرآن نیکی کرنے کے چند مخصوص اعمال کا ذکر کرتا ہے، مثلاً نماز پڑھنا، غریبوں کی مدد کرنا وغیرہ۔ یہ آیت واضح طور پر یہ حقیقت بیان کر رہی ہے کہ خیر وشر کا منبع ایمان ہے۔

بنیادی انسانی قدروں کے فلسفے کا ایک گمراہ کن پہلو اس کی بنیاد پر ایک آفاقی اور ماورائے اسلام فلسفۂ عروج و زوال اخذ کرنا ہے۔ اس فلسفے کے مطابق قوموں کے عروج و زوال کا راز بنیادی انسانی قدروں کو اپنانے میں پنہاں ہے، یعنی جب کوئی قوم اجتماعی طور پر ان قدروں کا ارادہ کرلیتی ہے جو بنیادی انسانی قدریں ہیں تو پھر دنیا کی زمامِ کار اسے سونپ دی جاتی ہے، یہی قانونِ الٰہی ہے۔ جب تک مسلمان بحیثیتِ قوم ان اَقدار کے محافظ رہے تو وہ دنیا پر غالب رہے، آج مغرب نے اُنہیں اپنا رکھا ہے تو دنیا کی امامت کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا ہے۔ گویا یہ دلیل دنیاوی سیادت کا اخلاقی جواز بنیادی انسانی قدروں سے فراہم کرتی ہے نیز مسلمانوں اور مغرب کے غلبے کو ایک ہی معیار پر پرکھتی ہے۔

یہ دلیل اپنی وضع میں بالکلیہ غلط ہے، کیونکہ اسلامی نقطہ نگاہ سے بنیادی سوال یہ ہے کہ دنیا کی امامت وسیادت حاصل ہوجانے سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا معنی یہ ہے کہ چند ایسی اقدار ہیں کہ جو قوم اُنہیں اپنا لے، وہ لازماً خلافتِ اَرضی اور اُمتِ وسط کے درجے پر فائز کردی جاتی ہے اور نوعِ انسانیت کو جنت کی طرف بلانے میں امام بن جاتی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں، کیونکہ مغرب کے تسلط نے نوعِ انسانی کے لئے جنت نہیں بلکہ جہنم جانا سہل بنا دیا ہے کہ یہ شر کا غلبہ ہے۔ اگر کسی قوم کا عالمی غلبہ لازماً جنت بنانا سہل کرتا ہے تو مغرب کے لئے ایسا کیوں نہ ہوا؟

درحقیقت یہ دلیل دینے والے غلبے کو دنیاوی جاہ وحشمت، تسخیر کائنات، تصرف فی الارض سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے بالذات خیر تصور کرتے ہیں، جبکہ اسلامی نقطہ نگاہ سے نہ تو مطلوب غلبہ تصرف فی الارض میں آگے بڑھ جانا ہے اور نہ ہی غلبہ بذاتِ خود خیر ہوتا ہے، بلکہ خیر کا باعث تب ہوتا ہے جب خلافت کا باعث بنے اور غلبہ خلافت تب بنتا ہے جب احکاماتِ الٰہی کی پیروی کی جائے۔ چنانچہ اسلامی نقطہ نگاہ سے ایسی کوئی ماورائے مذہب قدر نہیں جسے اختیار کرنا خیر پر مبنی غلبے کا باعث بن جائے۔

مغرب کے غلبے کا راز یہ ہے کہ جس شر (آزادی اور خواہش نفس کی بندگی) کی وہ دعوت دیتا ہے، دنیا کی بڑی اکثریت نے اسے قبول کرکے اس کے حصول کے لئے ادارتی صف بندی اختیار کر رکھی ہے۔ مغرب کا غلبہ کسی بنیادی انسانی قدر کا نہیں بلکہ اوصافِ خبیثہ کی عمومیت کا نتیجہ ہے، اسی لئے وہ شر کا باعث بن رہا ہے۔ اسی طرح اسلامی غلبہ بھی کسی بنیادی انسانی قدر کا نہیں بلکہ شریعتِ اسلامی کی عمومیت کا نتیجہ تھا اور اسی لئے وہ خیر کا باعث بنا کیونکہ خیر اسلام کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس دلیل کا تقاضا یہ ماننا ہے کہ

① مغرب کا غلبہ درحقیقت حق کا غلبہ ہے[7] کیونکہ اس کی بنیاد آفاقی انسانی قدریں ہیں۔

② اصل مطلوب غلبہ وہی ہے جو مغرب نے حاصل کیا یعنی تصرف فی الارض میں اضافہ۔

③ غلبہ اسلام کا مطلب تصرف فی الارض کی امامت کا تاج مسلمانوں کے سر پر رکھ دینے کے سوا اور کچھ نہیں جس کے لئے سائنس وٹیکنالوجی کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں[8]۔

عروج وزوال کا یہ باطل فلسفہ درحقیقت تصرف فی الارض کو اہم ترین اسلامی قدر ثابت

---

[7] جیسے کہ علامہ اقبالؒ وغیرہ کا خیال ہے مغربی تہذیب کا باطن عین خیر اور اسلام پر مبنی ہے، البتہ اسے برتنے میں چند غلطیاں سرزد ہوگئیں

[8] یہی مسلم قوم پرستی ہے جس کا مقصد سرمایہ دارانہ نظم میں مسلمانوں کی جاہ وحشمت قائم کرنا ہے۔ دنیا کے سامنے ایک 'ماڈل اسلامی ریاست قائم' کرکے پیش کرنا اسی فکر کا ایک شاخسانہ ہے۔ اس ماڈل اسلامی ریاست کا نقشہ چند اسلامی ترمیمات کے ساتھ تقریباً وہی ہے جو سوئٹزرلینڈ اور دیگر سکینڈے نیویا Scandinavian ریاستوں میں قائم ہوچکی ہے، جہاں افراد کو ہیومن رائٹس کے علاوہ تمام ویلفیئر حقوق فراہم کئے جاتے ہیں۔

کرنے کا جواز ہے۔

درج بالا تفصیل سے واضح ہوا کہ اسلام پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں کسی تیسری اصطلاح کا استعمال نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ان کے ذریعے عدل، فطرت و خیر کی ایک غیر جانبدارانہ اور ماورائے اسلام اصلاح کا امکان پیدا ہوتا ہے اور جن کی روشنی میں احکاماتِ شریعت کی ازسرنو تشریح کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جو کہ شریعتِ الٰہی کے مفاہیم کو بدلنے کی ایک سازش ہے۔

یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی بھی اصطلاح غیر جانبدارانہ نہیں ہوتی، اگر ان اصطلاحات کے معنی ہم شریعت سے اَخذ نہیں کرتے تو فی زمانہ ان کے معنی غالب مغربی علمی و تہذیبی روایت ہی سے اَخذ کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب زدہ ذہن کے لئے ان تصورات کے شرعی معنی اجنبی ہوتے چلے جارہے ہیں، کیونکہ وہ ان کے معنی مغربی علمی روایت سے اَخذ کرتا ہے۔ افسوس کہ معتزلی سکالرز کو بجائے جدید ذہن تبدیل کرنے کے شریعت تبدیل کرنے کی فکر لاحق ہے جیسا کہ ان کے اس جملے ہی سے واضح ہوتا ہے:

''ہمیں اسلام کو موجودہ حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے تاکہ یہ جدید ذہن کے لئے قابل قبول ہوسکے۔''

یعنی عصر حاضر کے ذہن کی مابعد الطبعیاتی سطح کو انبیا کے طریقہ کار کے مطابق بدلنے کے بجائے جدید متکلمین نے اس ذہن کے اعتزال کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کا کام کیا جس کے نتیجے میں دین کا حلیہ تو بگڑ گیا مگر عصر حاضر کا ذہن جہاں تھا، وہیں رہا۔ لہٰذا کسی تیسری اصطلاح پر اصرار محض بے وقوفانہ حرکت نہیں بلکہ اسلام کو جدید بنانے کی ایک خطرناک چال ہے۔ مذکورہ خطرہ تصوراتی یا محض خطرہ ہی نہیں بلکہ یہ وہ عمل ہے جو اس سے قبل عیسائیت کے ساتھ ہو چکا اور اگر یہ رجحان جاری رہا تو اسلام کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔

اس تمام عمل میں مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ بعض اوقات اس کی اگلی صفوں میں وہ لوگ نظر آتے ہیں جو روایت پسندی کے علمبردار ہیں۔ جدید اعتزال کی اس لہر کا مقابلہ صرف اہل سنت والجماعت کے ان اُصولوں پر کیا جاسکتا ہے جو قرآن، سنت اور اجماع کے ساتھ اس تہذیبی و علمی روایت اور تسلسل پر بھی زور دیتا ہو جو اسلامی تاریخ کے بہترین دور میں رہا۔

ادبِ عربی سے ایک اقتباس

مولانا عبدالجبار سلفی

قابل رشک لمحۂ مسرت

امیر المؤمنین عبدالملک بن مروان قریشی اُموی نے شعراء و اُدبا کے اِعزاز میں دی جانے والی دعوتِ عام میں سرد و شیریں مشروبات، لذیذ ترین ماکولات اور رس بھرے تازہ ثمرات اتنی وافر مقدار میں مہیا کیے کہ دربارِ خلافت کے مہمانوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان میں علماء بھی تھے اور اُمرا بھی، شعرا بھی تھے اور ادبا بھی، مہذب شہری بھی تھے اور گنوار دیہاتی بھی۔ جب اُنہوں نے جی بھر کر من پسند مشروبات نوش کر لیے اور مرغوب کھانے تناول کر لیے تو اِدھر اُدھر کی باتوں سے دل بہلانے لگے۔ کوئی تو خوش ذائقہ مشروبات کی تعریف میں مصروف تھا اور کوئی رس بھرے تازہ پھلوں کی توصیف میں رطبُ اللسان۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ ہم نے اتنا وافر کھانا کسی کی دعوت میں نہ دیکھا ہوگا اور کوئی کہہ رہا تھا کہ ہم نے اتنا مزیدار کھانا کسی کی دعوت میں کھایا نہ ہوگا۔ اس مجلس میں موجود گنوار اَعرابی سے نہ رہا گیا اور وہ بول پڑا:

لوگو! جہاں تک کھانے کی مقدار کا تعلق ہے تو میں بھی اس میں تم سے متفق ہوں کہ واقعی ہم نے اتنا وافر کھانا کسی دعوت میں نہیں دیکھا، لیکن جہاں تک اس کھانے کے سب سے زیادہ لذیذ اور مزیدار ہونے کی بات کرتے ہو تو میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی بات سن کر تمام شرکاے محفل کھل کھلا کر ہنس دیئے اور اس کا مذاق اُڑانے لگے، لیکن امیر المؤمنین ہنسے نہ مسکرائے، بلکہ سنجیدگی سے اعرابی کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ تو نے یہ بات کس بنا پر کی؟

اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! بات یہ ہے کہ آپ کا کھانا واقعی وافر مقدار میں تھا، لیکن اتنا مزیدار نہیں تھا، جتنا مزیدار کھانا میں خود کھا چکا ہوں۔ امیر المؤمنین نے کہا: ہم تیرے دعوے کو اس وقت تک تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جب تک تو اپنے دعوے کو پوری وضاحت سے بیان نہ کرے۔ اس نے کہا:

اے امیر المؤمنین! ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں کسی دور میں وادئ حجر کی آخری سرحد پر واقع ہجر نامی بستی میں رہائش پذیر تھا، جہاں میرا باپ فوت ہوگیا اور وِرثے میں بھاری قرض اور بہت

سی مشکلات چھوڑ گیا جن سے نبرد آزما ہونے کی ذمہ داری میرے کمزور کندھوں پر آن پڑی۔ اس علاقے میں ہمارا ایک نخلستان بھی تھا اور اس میں کھجور کا ایک ایسا پیڑ تھا جس کی نظیر ملنی محال ہے، اس کی کھجوریں اس قدر نرم کہ نومولود شتر بچے کے گوشت کی نرمی اس کے مقابلے میں ہیچ تھی اور وہ اس قدر شیریں تھیں، گویا وہ عسل مصفی کی بیضوی ڈلیاں ہوں اور ان کی گٹھلیاں اس قدر باریک گویا وہ جو کے دانے برابر ہوں۔

اس پیڑ کی ان خوبیوں کی وجہ سے ایک جنگلی زیبری روزانہ رات کے پچھلے پہر اس کے نیچے آجاتی اور اپنے اگلے پاؤں اٹھا کر پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی اور پیڑ کے سر کی جانب سے نیچے لٹکی ہوئی کھجوریں کھالیتی اور تھوڑی دیر اس کے نیچے آرام کر کے طلوعِ سحر سے قبل ہی چلی جاتی۔ امیر المؤمنین! سچی بات یہ ہے کہ اس کا روزانہ اس طرح فصل اُجاڑنا مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس لیے ایک رات میں نے اپنا تیر کمان لیا اور اسے شکار کرنے نکل کھڑا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات کے اگلے پہر آتی ہوگی اور میں فوراً ہی اسے شکار کر کے واپس آجاؤں گا۔ لیکن میرا گمان غلط ثابت ہوا اور مجھے دن رات کے چوبیس گھنٹے اس کی تاک میں رہنا پڑا۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے مجھے تاک لیا ہو اور عمداً لیٹ ہوگئی ہو۔ خیر جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو وہ آئی اور اس نے اپنے اگلے پاؤں اُٹھا کر اور پچھلے ٹانگوں پر کھڑی ہو کر پیڑ کی لٹکی ہوئی کھجوریں کھانا شروع کر دیں۔ میں نے اسے نشانے پر لے لیا اور تیر مار کر اسے خاک وخون میں تڑپا دیا۔ پھر میں نے اسے ذبح کر کے اس کی ناف والے حصے کا گوشت نکال لیا اور اسے میں نے آتش دان میں لکڑی کے موٹے موٹے ٹکڑوں کو دکھایا جب وہ سرخ انگارے بن گئے تو ان کے اندر گوشت رکھ دیا اور اسے اوپر سے ڈھانک کر نیند پوری کرنے کے لئے سو گیا۔ جب پہر چڑھے میں بیدار ہوا تو اتنے عرصے میں گوشت پک چکا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے اردگرد سے راکھ صاف کی اور اس کے اندر تر و تازہ نیم پختہ کھجوروں کا توڑا اُلٹا دیا جب مجھے اس آتش دان سے عامر اور غطفان کے لہجوں کی مانند آواز سنائی دی تو میں نے کھجوروں کو گوشت کی بوٹیوں میں ڈال کر کھانا شروع کر دیا یہاں تک کہ میں سیر ہو گیا۔ اے امیر المؤمنین! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس جیسا لذیذ کھانا آج تک نہیں کھایا۔

اعرابی کی بات درست تھی، کیونکہ وہ بڑا صحت مند اور بھوکا تھا اور صحت اور بھوک ہی دراصل کھانے کو پُر لطف اور مزے دار بناتی ہیں۔ اگر انسان بیمار ہو یا پہلے سے ہی سیر شکم ہو تو اسے

دنیا کا کوئی کھانا اچھا نہیں لگتا، اگرچہ وہ کتنا ہی مزیدار ہو۔ موسم گرما کے تندرست روزے دار کو افطار کے وقت سادہ ٹھنڈا پانی کس قدر پیارا اور خوش گوار لگتا ہے اور روٹی کا خشک ٹکڑا کس قدر لذیذ لگتا ہے! شاید اس کے مقابلے میں دنیا بھر کے شکم سیروں اور بیماروں کو کبھی اتنی خوشی نصیب نہ ہوئی ہو، اگرچہ وہ کتنے ہی مزیدار کھانے کیوں نہ کھالیں اور پھر بیمار آدمی کو تو ویسے ہی روغنی پراٹھا بے ذائقہ اور جام شیریں، زہر محسوس ہوتا ہے۔ اس بنا پر امیر المؤمنین نے اعرابی کی بات سے اتفاق کیا اور کہا: واقعی تو نے لذیذ ترین کھانا کھایا اور پھر اعرابی سے گویا ہوا:

''ذرا یہ تو بتا کہ تو کون ہے؟''

اعرابی: اے امیر المؤمنین! میں وہ انسان ہوں جس کی ایک طرف بنو تمیم اور بنو اسد کا عنعنہ ہے اور دوسری طرف بنو ربیعہ کا کسکسہ اور یمنیوں کی غرابت ہے۔

امیر المؤمنین: اچھا، اگر تو ان میں سے ہے تو ان کے کون سے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔؟

اعرابی: جی میں آپ کے ننھیالی خاندان بنو عذرہ سے تعلق رکھتا ہوں۔

امیر المؤمنین: وہ تو بڑا فصیح اللسان خاندان ہے، بھلا تجھے بھی شعر و ادب سے شغف ہے؟

اعرابی: امیر المؤمنین آپ کچھ پوچھ کر ہی اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟

امیر المؤمنین: بتاؤ، عربوں میں سے سب سے مدحیہ شعر کس نے کہا ہے؟

اعرابی: جریر بن عطیہ نے، اور وہ یہ ہے:

ألستم خير من ركب المطايا؟ وأندى العالمين بطون راح؟

''کیا تم سواریوں پر سوار ہونے والوں میں سے افضل و اعلیٰ سوار نہیں ہو اور کیا تم کشادہ ہاتھ والے سخیوں میں سے فیاض ترین سردار نہیں ہو؟''

دربارِ خلافت کی اس مجلس عام میں اس شعر کا شاعر جریر بن عطیہ بھی موجود تھا، وہ سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا اور سر اونچا کر کے شرکائے مجلس پر نظریں گھمانے لگا تاکہ ان کے تاثرات کا جائزہ لے سکے۔ امیر المؤمنین نے اعرابی سے دوسرا سوال کیا: کہ اب بتاؤ، عربوں میں سب سے زیادہ فخریہ شعر کس نے کہا ہے؟

اَعرابی: جریر بن عطیہ نے، اور وہ یہ ہے:

إذا غضبت عليك بنو تميم حسبتَ الناس كلهم غضابًا

''جب تجھ پر بنو تمیم غضبناک ہو جاتے ہیں تو تو سب لوگوں کو اپنے اوپر غضبناک سمجھنے لگتا ہے۔''

یہ سن کر جریر کے دل میں مسرت کی لہریں موجزن ہو گئیں اور وہ بے خود ہو کر جھومنے لگا۔

امیر المؤمنین: اچھا بتاؤ، عربوں میں سب سے بڑھ کر ہجو یہ شعر کس نے کہا ہے؟

اعرابی: جریر بن عطیہ نے، اور وہ یہ ہے:

فغض الطرف إنك من نمير فلا كعبًا بلغت ولا كلابا

''آنکھیں پست کرلے، کیونکہ تو نمیر قبیلے سے ہے۔ نہ تو تو کعب کے مقام کو پاسکتا ہے اور نہ کلاب کے مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔''

یہ سن کر جریر کا دل اس کے سینے میں رقص کرنے لگا اور وہ بے تابانہ اُٹھ کھڑا ہوا تاکہ انسانوں سے بھرا ہوا دربار اسے دیکھ سکے۔ یقین جانئے کہ جریر کو اس موقع پر جو مسرت حاصل ہو رہی تھی، اس کے مقابلے میں شاہوں کے شاہی پروٹوکول کی لذت ہیچ تھی اور پھر پُرلطف کھانوں کی لذت اور مسرت کا تو ذکر ہی کیا۔ امیر المؤمنین نے اعرابی سے پوچھا کہ اب بتاؤ تشبیہ کے اعتبار سے سب سے اچھا شعر کس کا ہے؟

اعرابی: جریر بن عطیہ کا، اور وہ ہے:

سرى نحوهم ليل كأن نجومه قناديل فيهن الذبالا لمفتل

''اور ان کی طرف رات کی تاریکی جیسا لشکر جہاد چل پڑا اور اس کے ستاروں جیسے نیزے گویا مضبوط بٹی ہوئی بتیوں والی قندیلیں ہیں۔''

یہ سن کر جریر بول پڑا کہ امیر المؤمنین میرا آج کا انعام اس عذری اعرابی کو دے دیا جائے۔ امیر المؤمنین نے فرمایا: نہیں اے جریر! اسے آپ کے انعام جتنا انعام سرکاری خزانے سے ملے گا اور ہم آپ کے انعام کو بھی کم نہیں کریں گے۔ چنانچہ اعرابی اس دربار سے اس حال میں نکلا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں آٹھ ہزار درہم اور بائیں ہاتھ میں نفیس کپڑوں کا گٹھا تھا۔ یہ تو خیر سے جریر کے سامنے کی بات تھی جس سے اس کے اشعر الشعرا ہونے کا ثبوت مل رہا تھا، لیکن صدیوں بعد والے عرب نقاد بھی یہ بات ماننے پر مجبور ہوگئے کہ جریر سے بڑھ کر غزلیہ شعر بھی کسی نے نہ کہا ہوگا، اور وہ یہ ہے:

إن العيون التي في طرفيها حور قتلننا ثم لم يحيين قتلانا

يصرعن ذا اللبّ حتى لا حراك به وهن أضعف خلق الله إنسانًا

''اس کی نگاہِ سیاہ اَبرو نے ہمیں قتل کردیا اور پھر ہماری لاشوں میں جان بھی نہ ڈالی۔ وہ عقل مند کو اس طرح زیر کرتی ہیں کہ اس میں دم تک نہیں رہتا، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی سب سے نازک مخلوق ہیں۔''

LRL No. 183
Vol.41 NO.5

Monthly MUHADDIS Lahore

5866476
5866396

☜ عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر اِفہام وتفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

☜ علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکارِ انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

☜ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

☜ تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظرانداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

☜ آئین وسیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

☜ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ **محدث** لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات ومحاسن سے مزین پائیں گے، اِن شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

قیمت فی شمارہ ۲۰ روپے ——— زرِ سالانہ ۲۰۰ روپے

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL 99-J, Model Town, Lahore: 54700